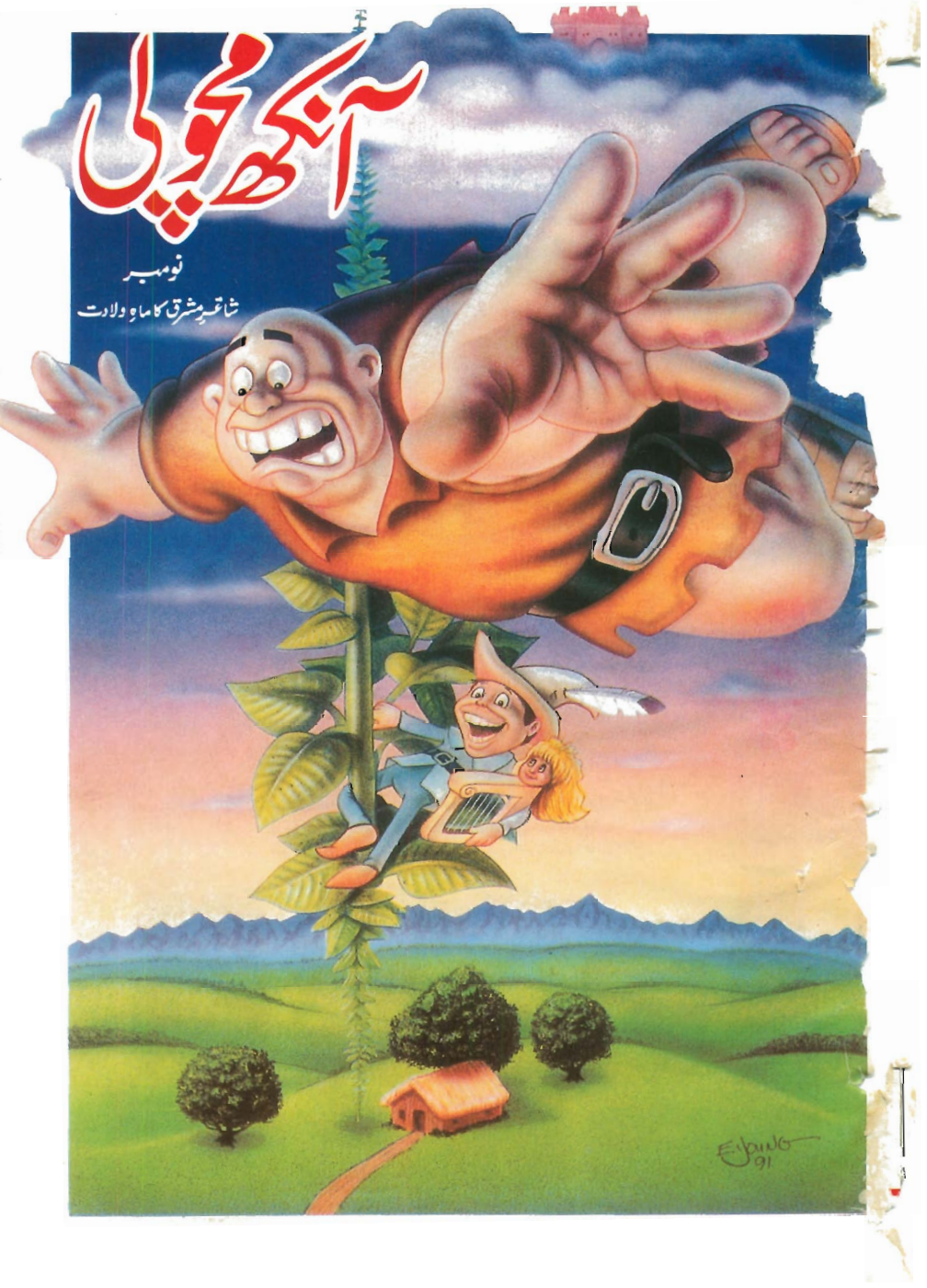

آنکھ مچولی

نومبر

شاعرِ مشرق کا ماہِ ولادت

لذّت کی دُنیا میں ایک مُعتبر نام
احمد
©
احمد کے جام جیلی، ٹماٹو کیچپ اور پکے پکائے کھانے اپنے منتخب اجزا، اعلیٰ معیار
اور بے مثل ذائقے کے سبب ملک اور بیرون ملک بے حد پسند کیے جاتے ہیں
لذیذ اور معیاری اشیاء کے لیے ہمیشہ احمد کی مصنوعات کا انتخاب کیجیے جنہیں
برسوں سے صارفین کا اعتماد حاصل ہے۔
احمد کا نشان معیار کی پہچان
AHMED Tomato Ketchup
AHMED Tomato Ketchup
AHMED PINEAPPLE JELLY
Net wt. 14 oz (400 g)
AHMED Chicken Masala Powder
AHMED RASPBERRY JAM
NET WT. 14 oz. (400 g)
AHMED APPLE PRESERVE (APPLE IN SYRUP)
پایا
قدرت نے ذائقہ دیا، احمد نے محفوظ کیا
ORIEN

UHU (یوہو) کِڈز کلب

دنیا کی سب سے اچھی GLUE بنانے والی مشہور زمانہ جرمن کمپنی ®UHU (یوہو) نے قارئین آنکھ مچولی کے لئے پُرکشش CASH انعامات کا اعلان کیا ہے۔ درجِ ذیل سوالات کے درست جوابات ارسال کریں اور CASH انعامات حاصل کریں۔

پہلا انعام	2 ہزار روپے نقد
دوسرا انعام	1 ہزار روپے نقد
تیسرا انعام	500 روپے نقد

ہر درست حل پر ایک ®UHU کی T. SHIRT

مقابلہ نمبر 5

1 لفظ "فی سبیل اللہ" کے معنی بتائیں؟

2 پاکستان اسلامی ماہ کی کس تاریخ کو آزاد ہوا؟

3 ٹیلی فون کس نے ایجاد کیا؟

4 شیخوپورہ میں ہونے والے حالیہ کرکٹ ٹیسٹ میچ میں وسیم اکرم نے کون سے ریکارڈ قائم کئے؟

5 شعر مکمل کیجئے

ع ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

شرائط

1: جوابات کے ساتھ ایک عدد ®UHU stic پر لپٹا ہوا پلاسٹک ریپر ضرور بھیجیں۔ 2: ایک سے زائد حل کی صورت میں ہر حل کے ساتھ ®UHU ریپر بھیجنا لازمی ہے۔ 3: انعامات کا فیصلہ ایک سے زائد درست جوابات کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔ (4): انعامات کا اعلان حتمی اور ناقابل چیلنج ہوگا۔ 5: تمام حل 10 دسمبر تک لازمی آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کریں۔ 6: خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان جنوری کے شمارے میں کیا جائے گا۔

Don't Say GLUE — Say UHU®

مقابلہ نمبر ۳ کے نتائج آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے

آنکھ مچولی

تحریری مباحثہ

شرکت کی آخری تاریخ ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء

اس ایوان کی رائے میں

لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں

لڑکیاں کہتی ہیں	لڑکے کہتے ہیں
ہم زیادہ قابل، محنتی اور ذمے دار ہیں	اس ملک کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں ہے۔
امتحانوں میں اکثر پوزیشنیں ہم لیتے ہیں	دفاتر اور کارخانے ہمارے دم سے ہیں۔
والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری ہم کرتے ہیں	ترقی کا پہیہ ہماری وجہ سے گھوم رہا ہے۔
پاکستان کی عزت ہمارے دم سے ہے	ہم محنتی اور سخت کوش ہیں۔
اور یہ لڑکے نکھٹو ... کام کے نہ کاج کے	لڑکیاں بے چاری تو گھرداری کے سوا
دشمن اناج کے	کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔

آپ کیا کہتے ہیں؟

اپنا مؤقف صاف صاف لکھئے، فیصلہ بہتر مؤقف اور مضبوط دلائل کی روشنی میں ہوگا

منصف ہیں معروف مقررہ | خوش بخت شجاعت

آپ کے لیے تین بہترین انعام ہیں

نتائج مقابلہ نمبر جنوری ۱۹۹۷ء میں دیکھئے

انوکھے خیال اچھوتی مثال

آنکھ مچولی کراچی

نومبر

شاعرِ مشرق کا ماہِ ولادت

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مغل
محمد جاوید خالد

امورِ انتظامی
تجمل حسین چشتی
طارق فوزی

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہد محمود

امورِ تشہیر
عمران احمد

شعبۂ متن مکین
محمد سلیم اختر (خطاطی)
مومن رحیم (لیکچر)
دانش اختر (پینٹنگ)

جابر بن حیان

نامور مسلمان سائنسدان جو علم کیمیا کا بانی تھا۔ جس کی کتابیں آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں مستند ہیں۔

واضح رہے ——— ۱

اس کتاب میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جاسکتی۔

۲ ———

اس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث) کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳ ———

اس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل ارگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشوونما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

۴ ———

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے۔

قیمت - ۱۸ روپے - ۷ درہم - ۷ ریال

زرِ سالانہ

۲۸۰ روپے (مع ڈاک خرچ) پاکستان
۱۰۰ ریال (مع ڈاک خرچ) مشرقِ وسطیٰ
۱۰۰ درہم (مع ڈاک خرچ)

ناشر : ظفر محمود شیخ
طابع : زاہد علی
مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
فون نمبر : 4942057-4948210

خط و کتابت کا پتہ

آنکھ مچولی
گرین گائیڈ اکیڈمی، اپنی آئی بی کالونی، کراچی ۵

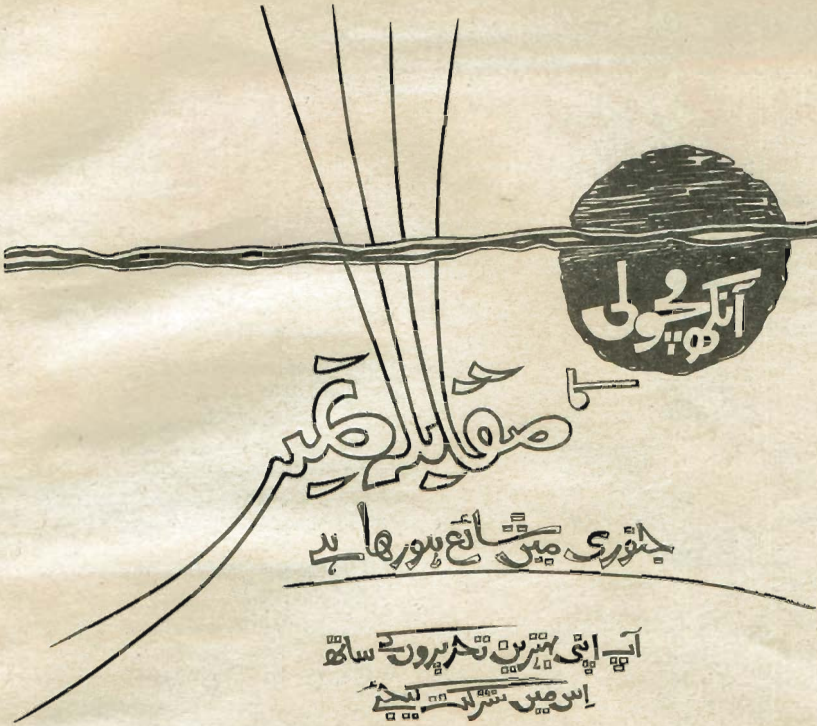

آنکھ مچولی

کا

سالگرہ نمبر

جنوری میں شائع ہو رہا ہے

آپ اپنی بہترین تحریروں کے ساتھ
اس میں شرکت کیجئے

خوبصورت کہانیوں، دلچسپ مقابلوں
اور معلوماتی مضامین کے علاوہ
نظموں، لطیفوں، کارٹون اور رنگین تصاویر کے ساتھ
اس مقابلے میں شرکت کرنے والوں کے لیے ہمارے پاس

انعامات کے انبار ہیں

دیر نہ کیجئے

شرکت کی آخری تاریخ 30 نومبر 96ء

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف	شیخ سعدیؒ	۸
پہلی بات	ڈاکٹر طاہر مسعود	۹
تُو مالک میں تیرا بندہ (حمد)	بشیر اعجاز	۱۰
صدیقِ اکبرؓ	حافظ حسن عامر	۱۱
سُن تو سہی	محمد عادل منہاج	۱۵
بچّوں کا عالمی گیت (نظم)	محمد سلیم فاروقی	۱۹
اسکول میں پہلا دن	فیض احمد فیض	۲۰
انوکھی دُنیا	ترجمہ: اشرف صبوحی دہلوی	۲۳
زندگی کے راستے	عبدالسلام سلامی	۲۵
حنبطی	عفیفہ اطہر	۳۲
پانی کا سفر	احمد حاطب صدیقی	۳۸
شاہد آفریدی (انٹرویو)	عمران خالق	۴۶
پاپ میوزک	افتخار احمد حماد	۴۹
لطیفے شطیفے	منتخب لطائف	۵۱
بلیک ہول	ناظر محمود	۵۵
قصہ کوئز ۳۰	محمد سلیم مغل	۶۰
چاند نگر (نظم)	محسن علی	۶۳
نامے میرے نام	قارئین کے خطوط	۶۴
مفت کی سواری	کمال احمد حازم	۶۸
شارجہ میں کرکٹ کا میلہ	سید یحییٰ حسینی	۷۵
بال کی کھال	محمد ریحان خان	۷۹
بچت (نظم)	شبیر بیگ ناز	۸۰
ماسٹر رمضان	یونس جاوید	۸۱
پہلی بار	محمد صابر	۸۷
کم سن	محمد جاوید خالد	۹۱
علامہ محمد اقبال	منیر احمد فردوس	۹۷
افکارِ اقبال (نظم)	محمد علی انصاری	۱۰۴
شریف جانور	نیاز محمد نوحزنی	۱۰۵
اسمِ اعظم	احسان الحق حقانی	۱۰۷
طرابلس	الطاف حسین	۱۱۲
قلم دوست	نو آموز قلمکار	۱۱۹
اقراء	خالد بن محمود احمد	۱۳۰

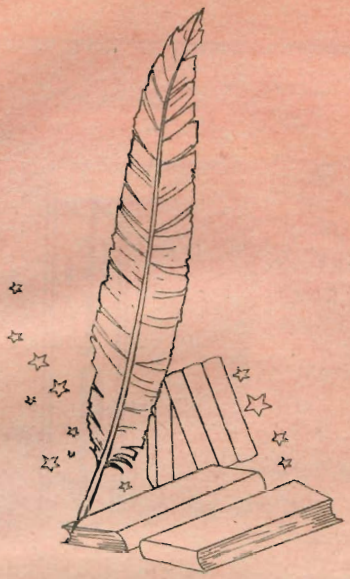

سنہرے حروف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی انگوٹھی میں ایک ایسا قیمتی نگینہ جڑا ہوا تھا جس کی قیمت و اہمیت کا صحیح اندازہ جوہری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ گویا دریائے نور تھا جو رات کو دن میں بدل دیتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دفعہ سخت قحط پڑ گیا۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ حضرت عمرؒ کو ان حالات کا علم ہوا تو لوگوں کی امداد کے لئے انگوٹھی کا وہ قیمتی نگینہ بھی فروخت کر دیا۔ اور جو قیمت ملی اس سے اناج خرید کر تقسیم کر دیا۔ جب اس کا علم آپ کے بہی خواہوں کو ہوا تو ان میں سے ایک نے آپؒ سے کہا "یہ آپ نے کیا کیا؟ ایسا بیش بہا نگینہ بیچ دیا۔"

حضرت عمرؒ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ "وہ نگینہ مجھے بھی پسند تھا لیکن میں یہ بات گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں اور میں قیمتی نگینہ پہنے بیٹھا رہوں۔ کسی حکمران کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کو تکلیف میں مبتلا دیکھے اور اپنے آرام اور زیب و زینت کے سامان کو عزیز رکھے۔" یہ فرماتے ہوئے آپ کے رخساروں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

(اقتباس از حکایات سعدیؒ)

مرسلہ : شاہد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا۔

پہلی بات

ڈاکٹر طاہر مسعود

دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو تو لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی ان ہونی بات ہے اور نہ شرمندگی کی بات۔ اختلاف سے تو زندگی کی رونق ہے۔ اور جب اختلاف ہوتا ہے تو بحث و تکرار کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ بری بات یہ ہے کہ بحث و تکرار بڑھ کر مار پیٹ کی شکل اختیار کرلے۔ ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی جاہل اور نادان لوگ کرتے ہیں پڑھے لکھے اور تمیزدار لوگ اپنے اختلافات زبان تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ سخت غصے کی حالت میں بھی زبان سے کوئی بری بات نہیں نکالتے۔ آج کل دیکھا گیا ہے کہ اچھے بھلے لڑکے بھی غصے میں ہوں تو سخت مغلظات بک رہے ہوتے ہیں اور ان میں بعض تو عادتاً" بھی گالیاں دیتے ہیں۔ ہر دوسرے جملے میں ایک موٹی سی گالی چپکی ہوئی ہوتی ہے ایسے لڑکے جہاں بھی جائیں گے اور جس سے بھی ملیں گے' اپنے والدین اور اپنے اسکول کو بدنام کریں گے۔ چنانچہ شریف لوگ اور اچھے گھرانوں کے بچے تو ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ تاکہ ان کی صحبت میں رہ کر ان کی اپنی زبان اور عادتیں بھی خراب نہ ہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ ہو" اس حدیث سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مار پیٹ اور گالی گلوچ کرنا کتنی خراب بات ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جن بچوں میں اس قسم کی عادتیں ہوتی ہیں' وہ خود تو لڑتے ہی ہیں' کبھی کبھار وہ اپنی لڑائی میں اپنے والدین کو بھی شریک ہونے پر مجبور کردیتے ہیں۔ چنانچہ بچوں کی لڑائی' بڑوں کی لڑائی میں بدل جاتی ہے اور پھر وہ گھمسان کا رن پڑتا ہے کہ خدا کی پناہ۔!

سمجھ دار بچے ایسا نہیں کرتے۔ اول تو ان کا اختلاف اتنا بڑھتا ہی نہیں کہ نوبت اٹھا پٹخ تک آئے۔ دوسرے وہ اپنے لڑائی جھگڑے گھر کے باہر ہی طے کرلیتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی زیادہ ظلم و زیادتی کر رہا ہو تو والدین کے علم میں لانا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ مسئلے کو اچھے طریقے سے سلجھا دیں۔

بلاشبہ دوسروں کی زیادتی پر غصہ بھی آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ لیکن سب سے اچھا جواب خاموشی ہے' سب سے اچھا جواب تحمل اور برداشت ہے۔ یہ کام مشکل تو ضرور ہے لیکن دشمن کو دوست بنانے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔

تُو مالک، مَیں تیرا بندہ

بشیر اعجاز

تو خالق تو مالک سب کا
سب کچھ ہو کے بھی ہے تنہا

رفعت تیری پربت پربت
تیری سخاوت دریا دریا

شمس و قمر میں تیری تجلی
تیرا نظارہ صحرا صحرا

رنگ ہیں تیرے قوس و قزح میں
گلشن گلشن جلوہ تیرا

ذکر ترا ہے فرش زمیں پر
عرش بریں پر تیرا چرچا

اتنی نسبت بھی کیا کم ہے
تو مالک میں تیرا بندہ

میں ہوں وہ اعجاز کہ جس نے
ہر دم تجھ کو ٹوٹ کے چاہا

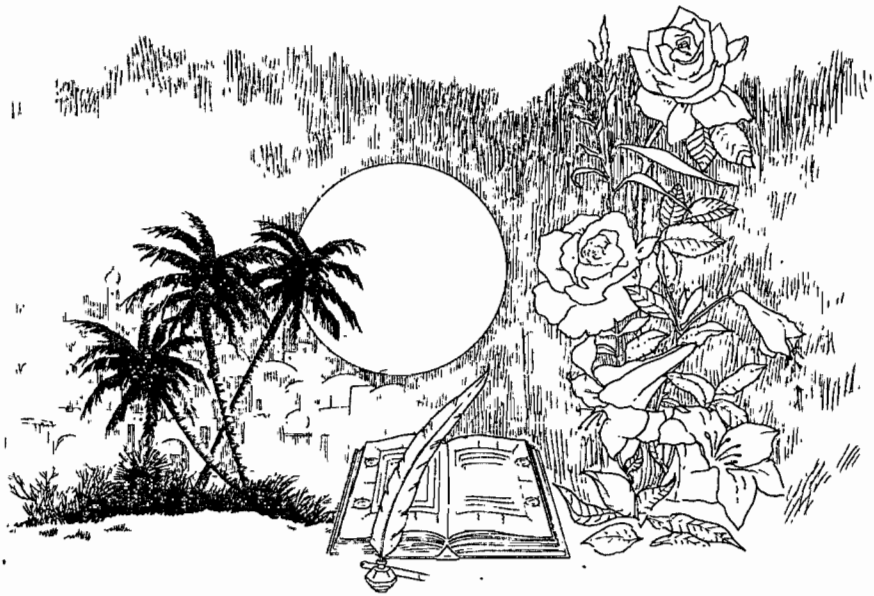

صدیق اکبرؓ

کوہِ استقامت

حافظ حسن عامر

رنگ گورا ' قد لانبا' پیشانی بلند' آنکھیں قدرے اندر کی جانب' داڑھی جو مہندی کے خضاب سے اکثر سرخ رہا کرتی' انگلیوں کی جڑیں گوشت سے خالی اور بدن چھریرا۔ اپنے حلیے سے منفرد نظر آنے والے یہ صحابی خود صحابہؓ کے حلقے میں بھی انفرادی شان کے مالک ہیں۔ اسلام لانے سے پہلے بھی حسنِ اخلاق' دیانت و امانت اور خاندانی وجاہت میں آپ امتیازی شان رکھتے تھے۔ اللہ کے نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے بچپن ہی سے دوستی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک نبوت کے نور سے معمور ہوگیا تو آزاد مردوں میں سب سے پہلے "ایمان کی

روشنی" انہوں نے ہی قبول کی۔ سچے تھے اور ایسے سچے کہ زبانِ رسالتؐ نے صدیق کا لقب عطا کیا۔ یہ لقب اتنا موزوں اور مکمل تھا کہ نام ہی کا ایک حصہ بن گیا۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

معراج کی صبح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے واقعات بیان کئے تو کافروں نے مذاق اڑایا۔ کفار و مشرکین اور بت پرستوں کا ایک جم غفیر حضرت ابوبکرؓ کے اطراف جمع ہوگیا۔ اور کہنے لگا کہ "ابوبکرؓ! وہ تمہارے دوست جو اللہ کی طرف سے وحی اترنے کا دعویٰ کیا کرتے تھے اب وہ اپنے اللہ سے بھی ملاقات کر آئے ہیں، کیا تم ان کی اس عجیب و غریب بات کو بھی مان لوگے؟"

حضرت ابوبکرؓ نے فوراً ہی جواب دیا!

"کیوں نہیں میں تو اس سے بھی عجیب باتوں کو مانتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ آسمان سے فرشتہ میرے پاس آتا ہے اور صبح و شام اللہ کی جانب سے مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ میں تو اس کو بھی مانتا ہوں۔"

نبوت کی یہی وہ بے ساختہ گواہی تھی جس پر دربار رسالتؐ سے "صدیق" کا لقب عطا ہوا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ساری مومنانہ زندگی اور اس زندگی کا ایک ایک لمحہ اس قابل ہے کہ اسے دلوں میں اتارا جائے اور اس کی مدد سے زندگیوں کو سنوارا جائے۔ لیکن ایک چیز جو آپ کی ساری زندگی کا احاطہ کرتی ہے وہ ہے سچ اور سچ پر استقامت۔ سچائی کی جس منزل پر آپ کھڑے ہوگئے، کسی ترغیب، کسی آزمائش اور کسی خوف سے آپ کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر آپ کے جاں نثاروں پر بجلی بن کر گری۔ وہ تو آپؐ کی جدائی کے تصور کے لئے بھی تیار نہ تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو تلوار سونت کر کھڑے ہوگئے اور فرمانے لگے کہ "جو یہ کہے گا کہ اللہ کے رسولؐ وفات پاگئے ہیں تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔" ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو سب سے زیادہ غم زدہ تھے مگر جنہوں نے سب سے زیادہ ہوش کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے دکھی دلوں کو یکجا کیا اور فرمایا۔ :

"جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاچکے ہیں لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بے شک اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور وہ ہمیشہ

رہے گا۔"

آپؓ نے اسی موضوع پر سورہ آل عمران کی لافانی آیات بھی تلاوت فرمائیں اور بلاشبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تقریر جادو اثر ثابت ہوئی۔ صحابہ کرامؓ نے صبر کی عظیم الشان دولت سے کام لیتے ہوئے اپنا دھیان اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں پر لگادیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے رومیوں سے "جنگ موتہ" کا انتقام لینے کے لئے حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرداری میں ایک لشکر تیار کیا تھا۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ لیکن ابھی لشکر روانہ نہیں ہوا تھا کہ اللہ کے رسولؐ وفات پاگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے کوچ کرتے ہی عرب میں "ارتداد" (دین سے پھر جانا) کی وباء پھیل گئی۔ نو مسلم قبائل ایک ایک کرکے مرتد ہونے لگے۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ بعض صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لئے لشکر اسامہؓ کی روانگی ملتوی کردی جائے۔ پہلے مرتدین سے نمٹ لیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس مشورہ کو بالکل قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ :

"میں اس جھنڈے کو نہیں کھول سکتا جسے رسول اللہؐ نے اپنے دستِ مبارک سے باندھا ہو"

اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ اسامہؓ کے بجائے، جو ایک نوعمر اور ناتجربہ کار شخص ہیں، کسی اور کو سردار بنادیجئے۔ آپؓ نے غصے سے فرمایا کہ

"جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار بنایا ہو اسے معزول کرنے کے لئے مجھے کیا حق ہے؟" وقت نے ثابت کیا کہ لشکر اسامہؓ کی روانگی اسلام کے حق میں سراسر خیر اور رحمت کا باعث ہوئی۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کچھ عرب قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ وقت بہت نازک ہے، جو لوگ زکوٰۃ سے انکار کرتے ہیں فی الحال ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ۔

"اللہ کی قسم! اگر کوئی ایک بکری کا بچہ دینے سے بھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جاتا تھا، انکار کرے تو میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ چاہے میں تنہا ہی کیوں نہ رہ جاؤں اور چاہے میری بوٹیاں چیل اور کوے ہی کیوں نہ

نوچ نوچ کر کھا جائیں۔"

غرض کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ایمانی قوت نے دشمنوں کی طاقت کی پرواہ نہ کی اور ان کے سامنے عزم و استقلال، اثبات و استقامت کی فولادی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے۔ اس چیز نے دین مبین کو اور روشن کر دیا اور بھٹکے ہوئے لوگ حلقۂ اسلام میں پھر جوق در جوق داخل ہونے لگے۔

صدیق اکبرؓ کے فضائل کا کوئی شمار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لافانی کلام "قرآن پاک" میں آپؓ کا ذکر خیر شامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کا مطلب ہے کہ "میں نے سب کے احسانات کا بدلہ اتار دیا لیکن ابوبکر صدیقؓ کے احسانوں کا بدلہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ خود عطا فرمائے گا۔"

اس عظیم مرتبے اور اس اونچے مقام کو سمجھنے کے لئے صرف ایک چیز ہی کافی ہے کہ آپؓ ایمان لائے اور پھر اس پر ثابت قدم ہوگئے، ڈٹ گئے۔ کسی مرحلے پر کوئی چیز آپؓ کے قدموں میں لرزش پیدا نہیں کر سکی۔ کوئی مصلحت کبھی آپؓ کو سچ کہنے اور حق اختیار کرنے سے نہیں روک سکی۔ وہ دل و دماغ کی گہرائیوں سے مومن تھے اور سرتاپا کوہ استقامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

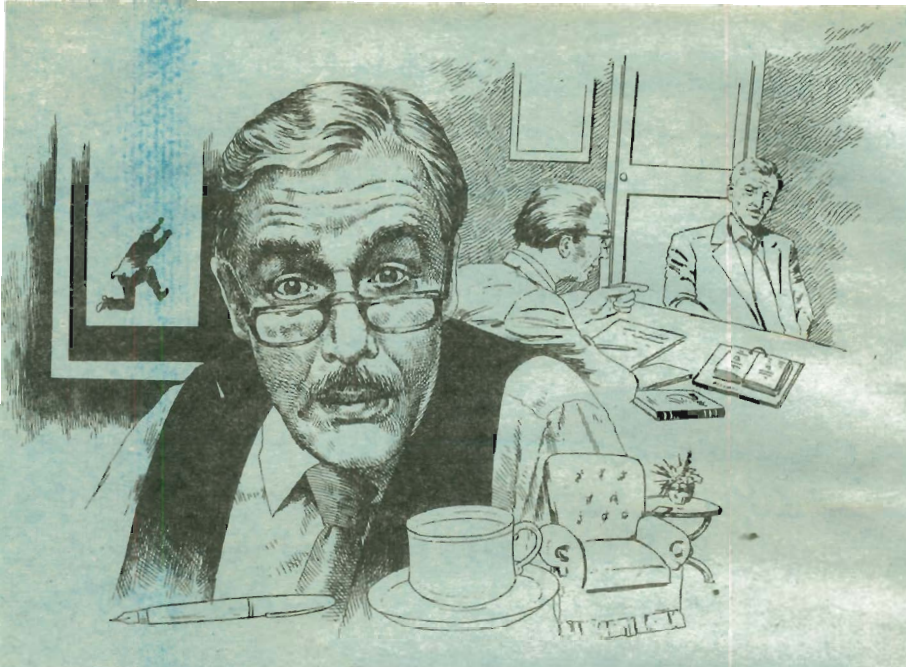

سن تو سہی

محمد عادل منہاج

"میرے گھر کی چیزوں نے بولنا شروع کردیا ہے۔" یہ جملہ سن کر ڈاکٹر کرامت نے بغور اس شخص کو دیکھا جو بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوچکا تھا۔ سر میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی کالا بال نظر نہیں آرہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے کلینک میں داخل ہوا تھا اور بشیر احمد کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ پھر بہت ہچکچاتے اور گھبراتے ہوئے اس نے یہ جملہ بولا تھا مگر ڈاکٹر کرامت کو بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ تو اس سے بھی عجیب و غریب باتیں کرتے تھے۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا لہٰذا اس کے پاس سارے ایسے ہی نفسیاتی کیس آتے۔

"یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دس دن پہلے، ٹھیک دس دن پہلے کی بات ہے جب میں نے گھر میں داخل ہو کر زور سے دروازہ بند کیا تو وہ بولا "ذرا آرام سے"۔ میں گھبرا گیا اور اسے اپنا وہم سمجھ کر اندر داخل ہو گیا۔ مگر جب میں صوفے پر بیٹھا تو وہ بھی بول اٹھا۔ "تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے"۔ میں پریشان ہو گیا اور صوفے سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ شکر ہے وہ خاموش رہی۔ پھر رات کو سو رہا تھا تو کئی بار ایسا لگا کہ چارپائی بول رہی ہے۔ "تم کروٹیں بہت بدلتے ہو"۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن میرے گھر کی ہر چیز ہی کچھ نہ کچھ بولتی رہتی ہے۔" بشیر احمد نے بتایا۔

"ہوں۔ کیا یہ چیزیں ہر وقت بولتی رہتی ہیں یا کسی خاص وقت؟" ڈاکٹر کرامت نے پوچھا۔

"عام طور پر شام کو۔"

"آپ کب سے تنہا رہتے ہیں؟"

"کوئی ایک سال سے۔" وہ آہ بھر کر بولا۔ "دونوں بیٹے تو بہت پہلے ہی امریکہ جا کر سیٹ ہو چکے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ بیٹیاں بھی اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ پچھلے سال میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اب تو بس میں سارے گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔"

"آپ کی روزانہ کی مصروفیات کیا ہیں؟"

"بھلا ایک ریٹائرڈ شخص کی کیا مصروفیات ہو سکتی ہیں؟ صبح ناشتے کے بعد لائبریری چلا جاتا ہوں۔ دوپہر تک بیٹھا ایک ایک اخبار چاٹتا رہتا ہوں۔ پھر گھر آجاتا ہوں۔ کھانے کے بعد آرام کرتا ہوں اور شام سے رات تک یا تو ٹی وی دیکھتا ہوں یا کچھ پڑھتا ہوں اور جب کسی کام کو دل نہیں کرتا تو بیٹھا ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔"

بشیر احمد خلا میں گھورتا ہوا بولا۔

"ہوں، دیکھئے بشیر صاحب دراصل یہی آپ کا مسئلہ ہے۔ آپ تنہائی کا شکار ہیں۔ اور اتنے بڑے گھر میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہتے ہیں چونکہ آپ کسی سے بات کرنے کو ترستے ہیں اس لئے آپ کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گھر کی چیزیں آپ سے باتیں کرنے لگی ہیں۔" ڈاکٹر کرامت نے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ مجھے وہم ہو گیا ہے۔ میں وہمی اور پاگل ہوں۔ میں اسی لئے یہ بات کسی کو بتا نہیں رہا تھا۔ وہ تو پتہ نہیں کیوں کریم بیگ کے کہنے پر آپ کے پاس آگیا۔" بشیر احمد برا مان کر بولا۔

"کریم بیگ ..... یہ کون ہیں؟" ڈاکٹر کرامت نے پوچھا۔

"ہے ایک گورنمنٹ آفیسر، لائبریری میں اکثر

ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"اچھا ..... دیکھئے بشیر صاحب آپ ناراض مت ہوں۔ آپ نہ وہمی ہیں نہ پاگل۔ دراصل بعض اوقات انسان کی سوچیں اسے ایسے مناظر دکھا دیتی ہیں جو حقیقت نہیں ہوتے۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں کہ میرا اور آپ کا درد مشترک ہے۔" ڈاکٹر کرامت اداس انداز میں مسکرائے۔

"کیا مطلب!" بشیر احمد چونک کر بولا۔

"ہاں میں بھی آپ کی طرح تنہائی کا شکار ہوں۔ ایک ہی بیٹا تھا جو پڑھنے کے لئے باہر گیا تھا پھر اسے وہیں ملازمت مل گئی اور اس نے واپس آنا پسند نہ کیا۔ وہ ہمیں بھی وہیں بلاتا رہا اور پھر ایک دن میری بیوی بھی ناراض ہو کر اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی اور یوں میں بھی اکیلا رہ گیا۔"

"اوہ! ....." بشیر احمد کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔ وہ تو صرف خود کو تنہائی کا شکار سمجھتا تھا۔ یہاں تو اس جیسے اور بھی لوگ تھے۔

"ہاں مگر میں تو پھر بھی دن میں کلینک چلاتا ہوں لہٰذا میرا ٹائم گزر ہی جاتا ہے۔ اگرچہ ماہر نفسیات کے پاس کم ہی لوگ آتے ہیں لیکن مجھے کون سا پیسے کمانا ہیں میں تو بس وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ پھر بھی جب شام کو گھر جاتا ہوں تو گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہتا بس دل چاہتا ہے بیٹھا اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتا رہوں۔"

"اوہ ..... تو کیا آپ کے گھر کی چیزیں باتیں نہیں کرتیں۔" بشیر احمد نے پوچھا۔

"نہیں، بعض اوقات میری سوچیں میرے سامنے بھی واہمے تخلیق کر دیتی ہیں مگر میں چونکہ ان کی حقیقت سے واقف ہوں اس لئے ان پر توجہ نہیں دیتا اور اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے آپ کی بات درست ہو۔ مگر یقین کریں میں نے باقاعدہ چیزوں کو بولتے سنا ہے۔ یہ وہم نہیں شروع شروع میں تو میں ڈرا تھا مگر اب عادی ہو گیا ہوں۔ بلکہ اب تو اگر گھر کی چیزیں خاموش رہیں تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔" بشیر احمد نے کہا۔

"خیر آپ ایسا کریں کہ شام کو وقت گزارنے کے لئے کوئی مشغلہ اختیار کریں۔ باغبانی یا کوئی پالتو جانور پال لیں۔ اور یہ چند دوائیں بھی استعمال کریں۔" ڈاکٹر کرامت نے دوائیں لکھ کر کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر مجھے ان کی ضرورت نہیں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی

ہے۔ تم مجھے مریض سمجھ رہے ہو۔ میں مریض نہیں ہوں۔ تم تو خود میرے ہی بھائی ہو۔ میری طرح تنہائی کا شکار ہو۔ پھر بھی مجھے وہمی سمجھ رہے ہو۔ ڈاکٹر میرا خیال ہے کہ تم بھی اپنے گھر کی چیزوں سے باتیں کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے وہ تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں مگر تم توجہ نہ دیتے ہو۔ کبھی توجہ دو ڈاکٹر انسان تو انسان کو بھول جاتا ہے۔ چیزیں نہیں بھولتیں وہی تو ہماری تنہائی میں ہماری ساتھی بنتی ہیں۔ اچھا ڈاکٹر شام ہو رہی ہے مجھے اجازت دو میری کرسی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" بشیر احمد کلینک سے نکل گیا۔

ڈاکٹر کرامت اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"یہ تنہائی بھی عجیب چیز ہے۔ انسان کو کیسے کیسے واہموں اور الجھنوں میں ڈال دیتی ہے۔ انسان اکیلا ہو تو کیسی کیسی باتیں سوچتا ہے۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے اور کچھ نہیں تو گھر کی چیزوں سے ہی باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بے چارہ بشیر احمد۔" کرامت نے سوچا۔

"بے چارے تو تم بھی ہو ڈاکٹر کرامت..... بشیر احمد تو پھر تم سے اچھا ہے کہ کم از کم ہم سے تو باتیں کر لیتا ہے۔" اچانک اس کی کرسی بول اٹھی۔

ڈاکٹر کرامت بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ.... یہ کیا..... نن..... نہیں یہ میرا وہم ہے۔ بھلا کرسی اور باتیں کرے۔" ڈاکٹر کرامت بڑبڑایا۔

"نہیں ڈاکٹر۔ نہ تم وہمی ہو نہ بشیر احمد۔ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ ہم بھی بولتے ہیں مگر تم انسان کبھی ہماری باتوں پر کان تو دھرو۔ ہمیں سننے کی کوشش تو کرو۔" سامنے رکھی میز سے آواز آئی۔

ڈاکٹر کرامت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوف کے عالم میں تیزی سے کلینک سے باہر کو دوڑا۔

"رکو..... رکو تو سہی کہاں جا رہے ہو؟" دروازہ اس کے پیچھے چلا کر بولا مگر ڈاکٹر کرامت تو بدحواسی کے عالم میں سڑک پر دوڑا جا رہا تھا۔ اردگرد آتے جاتے لوگ اسے حیرت سے گھور رہے تھے۔ ادھر سڑک ناگواری کے عالم میں سوچ رہی تھی۔ "یہ کم بخت آرام سے نہیں چل سکتا کس بری طرح پاؤں مار رہا ہے۔"

بچوں کا عالمی گیت

سلیم فاروقی

یہ ہیں چینی، وہ جاپانی
ہم افریقی، تم افغانی
ریت دوئی کی ہوئی پرانی
کون سُنے یہ رام کہانی
بولو ہم سب بھائی بھائی

لوگو! سُن لو بات ہماری
گھر ہے ہمارا دنیا ساری
اس گھر کی ہر چیز ہے پیاری
چوکھٹ، دروازے، الماری
بولو ہم سب بھائی بھائی

کوہ و سمندر، دریا اپنے
چشمے، جھیل، تلیّا اپنے
وادی، گلشن، صحرا اپنے
ہم سب کے سب بھیّا اپنے
بولو ہم سب بھائی بھائی

ہم امن و الفت کے پجاری
جنگ و جدل ہے اک بیماری
کب سمجھیں گے بات ہماری
ہیں جو بچارے عقل سے عاری
بولو ہم سب بھائی بھائی

علم کی خوشبو پھیلائیں گے
بات عمل کی سمجھائیں گے
نقشِ جہالت مٹ جائیں گے
جب یہ ترانہ ہم گائیں گے
بولو ہم سب بھائی بھائی

اسکول میں پہلا دن

فیض احمد فیض

میری عمر تو جب آٹھ نو برس کی ہوگی، لیکن اسکول میں وہ میرا پہلا دن تھا۔ پہلے تین درجوں کی کتابیں گھر پر ہی پڑھ چکا تھا اور اس دن پہلے درجے میں نہیں، چوتھے درجے میں داخلے کے لئے تیاری تھی۔ شاید اسی سبب سے گھر کے سب لوگ مجھے اسکول بھجوانے کے لئے ضرورت سے زیادہ اہتمام کر رہے تھے۔

اسکول ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اس لئے اصطبل سے دو گھوڑوں والی فٹن نکلوائی گئی۔ یہ فٹن ہمارے ابا سال میں صرف دو بار عیدگاہ جانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پھر میری بڑی بہنوں نے لاڈ میں آکر مجھے بہت ہی بھڑکیلے، پر تکلف کپڑے پہنائے۔ جو عام طور سے شادی اور بیاہ کے موقعوں پر پہنائے جاتے تھے۔ سرخ مخمل کا کوٹ اور نیکر، پیازی رنگ کے موزے اور سفید جوتے۔

یہ سب کچھ مجھے آج بھی اس لئے یاد ہے کہ اس دن جو کچھ بھی اسکول میں میرے ساتھ گزری، اس میں زیادہ تر ہاتھ اسی لباس کا تھا۔

تو خیر اس براتیوں کی سی وضع قطع میں ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ایک ملازم ہماری کتابیں اٹھائے ساتھ ہوا۔ اور ہماری سواری اسلامیہ پرائمری اسکول کی پرانی ایک منزلہ عمارت کے سامنے جاکر کھڑی ہوئی۔

جیسے ہی ہم اپنی فٹن سے نیچے اترے تو کچھ لڑکے جو اسکول کے باہر ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے، ہمیں دیکھتے ہی زور زور سے غل مچاتے ہوئے اسکول کے اندر کی طرف بھاگے۔ لڑکوں کا شور سن کر ایک دو ماسٹر صاحبان ہڑبڑا کر باہر نکل آئے یہاں پہلے ہی مارے خوف کے کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے اوسان اور بھی خطا ہوگئے۔

ملازم کے پیچھے پیچھے بہت آہستہ اور مری ہوئی چال میں جب ہم نے اسکول کے اندر قدم رکھا تو ہر طرف سے بے شمار آنکھیں یوں گھورتی ہوئی نظر آئیں، جیسے کوئی چڑیا گھر کا جانور اسکول میں آگھسا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد چوتھے درجے کے ماسٹر صاحب مجھے کمرے میں ساتھ لے گئے اور کہا:

"جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ۔"

ہمارا شہر بھی غریب تھا اور یہ اسکول بھی غریب۔ پڑھنے والے بھی غریب تھے، پڑھانے والے بھی غریب۔

[illegible] فرش پر [illegible] ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر پہلے ہی سے پڑھنے والے بہت سے لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔

میں جب ان میں جاکر بیٹھا تو میرا جی چاہا کہ کوئی جن یا پری آئے اور چپکے سے میرے سب کپڑے لے جائے اور مجھے اپنے ساتھیوں کا سا پھٹا پرانا کرتا اور پاجامہ لادے۔ وہ سارا دن میں لڑکوں کے مختلف فقرے اور پھبتیاں سنتا رہا۔ اور میرے ہم جماعت لڑکوں کی آنکھوں سے سارا دن طنز اور حقارت برستی رہی۔

جب مجھے محسوس ہوا کہ زرق برق لباس اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے اپنے یا اپنے گھر والوں کے مال اور دولت کی نمائش کرنا بہت ہی گھٹیا اور مہمل بات ہے اور جب سے مجھے ان چیزوں سے نفرت ہوگئی۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ آدمی ٹھیک سے جبھی رہ سکتا ہے کہ اپنے ساتھیوں، ہم جولیوں اور ہم وطنوں سے مل جل کر، اور ان سا بن کر رہے۔ دوسروں سے الگ، اور بڑھیا نظر آنے کا چاؤ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ بات ہے۔

انوکھی دنیا

ترجمہ: اشرف صبوحی دہلوی

اگر کسی پرندے کا بچہ اپنے گھونسلے سے باہر پڑا ہوا ملے تو اس کی جان بچانے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ آپ اسے واپس اس کے گھونسلے میں رکھ دیں۔ اس خیال میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ بچے کے ماں باپ انسانی بُو کی وجہ سے گھونسلے میں نہیں آئیں گے۔ بہت سے پرندے تو سونگھنے کی قوت ہی نہیں رکھتے۔

جھینگر کے کان نہیں ہوتے اِس کے گھٹنوں میں نہایت باریک اعضاء ہوتے ہیں جن سے وہ سنتا ہے۔

مرغیاں ہمیشہ صبح سویرے انڈے دیتی ہیں۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ انڈا کہاں دیا ہے۔ بعض اوقات وہ تیرتے ہوئے پانی ہی میں انڈے دے دیتی ہیں۔ اگر آپ مرغیوں سے انڈے یقینی طور پر حاصل کرنا چاہیں تو ہر روز ساڑھے نو بجے صبح تک انہیں کہیں بند رکھیں۔

یہ کبھی گمنام تھے لیکن...

کم ہمت اور بے حوصلہ لوگ بڑی آسانی سے ہر کڑے وقت کو تقدیر سے منسوب کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

اگر محنت سے جی نہ چرایا جائے تو ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود، یہی تقدیر کامیابیوں کے دروازے بھی کھولتی ہے۔ یقین نہ ہو تو اسے پڑھیئے اور دیکھیئے کہ تاریخ کی کئی عظمتوں کا آغاز کس قدر معمولی تھا۔

۱۔ کرسٹوفر کولمبس، جس نے امریکہ دریافت کیا ایک جولاہے کا لڑکا تھا۔

۲۔ حکیم لقمان بچپن میں موم بتیاں بناتے تھے۔

۳۔ ناصرالدین بادشاہ بچپن میں ٹوپیاں بیچا کرتے تھے۔

۴۔ شمالی ویت نام کے آنجہانی صدر ہیوچی منہ ایک جہاز کے قلی تھے۔

۵۔ سقراط ایک عظیم فلاسفر ایک معمار کا بیٹا تھا۔

۶۔ ابراہیم لنکن امریکی صدر ایک مزارع کا بیٹا تھا۔

۷۔ فرانس کا عظیم حکمران نپولین ابتداء میں ایک معمولی سپاہی تھا۔

۸۔ نادر شاہ ابتداء میں ایک گڈریا تھا۔

۹۔ مشہور سائنس دان تھامس ایڈیسن ایک معمولی اخبار فروش تھا۔

۱۰۔ مشہور انگریز ادیب تھامس کارلائل ایک بڑھئی تھا۔

۱۱۔ فرانس کی مشہور ملکہ جوزیفائن ایک معمولی تمباکو فروش کی بیٹی تھی۔

۱۲۔ امریکی صدر آئزن ہاور ابتداء میں ایک اخبار فروش تھے۔

۱۳۔ برصغیر کے پہلے مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک تین روپوں میں فروخت شدہ غلام تھا۔

۱۴۔ روس کی مشہور ملکہ کیتھرائن فوج میں معمولی خادمہ تھی۔

۱۵۔ فریڈی مائیکل ایک معمار تھا۔ وہ جلد سازی بھی کرتا تھا۔

زندگی کے راستے

عبدالسلام سلامی

عبدالسلام سلامی تجربہ کار صحافی ہیں، ان کی صحافتی زندگی کا بیشتر حصہ ماہنامہ" رابطہ" اور خلیج سے شائع ہونے والے روزنامہ" خلیج ٹائمز" کے اردو ایڈیشن کے لئے کام کرتے گزرا۔ سلامی صاحب نے بڑی محنت اور جستجو سے ایک کتاب کے دو حصے مرتب کئے ہیں۔ کتاب کا عنوان بھی "زندگی کے راستے" ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے معروف قلم کاروں اور مختلف پیشوں سے وابستہ اہم شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کا مقصد نوجوانوں خصوصاً" طالب علموں کو دوران تعلیم، کیریئر پلاننگ کے بارے میں سوچ کا مواد فراہم کرنا اور بہتر سمت ان کی رہنمائی کرنا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ طالب علموں اور والدین دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین کی اشاعت تو آنکھ مچولی میں ممکن نہیں البتہ بنیادی اہمیت کے چند مضامین ہم اپنے پڑھنے والوں کے لئے وقتاً" فوقتاً" شائع کرتے رہیں گے۔ (ادارہ)

مستقبل.....؟

زندگی نامعلوم سمتوں اور ان دیکھی راہوں کا ایک پراسرار نام ہے جو بہ ظاہر انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم سب' ایک روشن' کامیاب اور خوشگوار مستقبل کی نہ صرف آرزو کرتے ہیں بلکہ اس کی امید بھی رکھتے ہیں۔ ایسا خوشگوار مستقبل جو کامیابیوں سے بھرپور ہو اور ہماری خواہشات کی تکمیل کرتا ہو۔ لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے لئے..... یا اپنی اولاد کے لئے ایک کامیاب مستقبل کی منصوبہ بندی کی ہو' زندگی کا مقصد متعین کیا ہو اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایک پروگرام مرتب کرکے جدوجہد کی ہو۔

کچھ لوگ یہ کام کرتے ہیں' لیکن اکثریت کی زندگی' انجانے راستوں پر بھٹکنے اور بعض اوقات ٹھوکریں کھاتے' بالآخر کسی ایک..... صحیح یا غلط' مطمئن یا غیر مطمئن' موزوں یا غیر موزوں راستے پر چل نکلتی ہے۔ دن اور رات آتے جاتے رہتے ہیں۔ بچپن' نوعمری' جوانی اور پھر بڑھاپا ایک دن زندگی کی شام ہوجاتی ہے' سفر تمام ہوجاتا ہے۔

کامیاب مگر نسبتاً" سہل زندگی گزارنا ہر انسان کی بنیادی تمنا ہوتی ہے۔ کامیابی اور ترقی پانے کے کئی راستے ہوتے ہیں' لیکن بنیادی اہمیت دو امور کو حاصل ہے۔ ایک ذاتی تجربہ اور دوسرا صحیح معلومات کا بروقت حصول۔ ذاتی تجربوں سے ترقی اور کامیابی پانا بڑی کٹھنائیوں کا راستہ ہے۔ اس راستے سے کامیابی پانے کے لئے بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے اور تجربے سے سیکھنے کے لئے بہت کچھ جھیلنا بھی پڑتا ہے۔ اس میں وقت بھی صرف ہوتا ہے اور محنت ضائع ہونے کا امکان بھی۔ اس کے برعکس اگر ضروری معلومات' جو دوسروں کے تجربے اور مشاہدے کا حاصل ہوتی ہیں ..... ضرورت کے وقت دستیاب ہوجائیں تو راستے کی دشواریوں کو دور کرکے کامیابی کی منزل کو آسان بھی بنادیتی ہیں اور کافی حد تک یقینی بھی۔ ترقی اور کامیابی کا سفر زندگی کا سفر ہوتا ہے۔ اس سفر میں ست روی کے مرحلے تو آتے ہیں مگر یہ سفر رکتا کبھی نہیں۔ طفولیت سے بچپن' بچپن سے لڑکپن' لڑکپن سے جوانی اور جوانی سے ذمہ دارانہ زندگی ..... یہ سب زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ ان مرحلوں کو کامیابی سے اور سہولت سے طے کرنا ہی زندگی کی کامیابی ہے۔ اسی بنیادی خیال کے

تحت' زندگی کے مختلف مراحل سے گزرنے والے اور زندگی کے مختلف میدان ہائے عمل میں کار گزار قارئین کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع اور پیشہ ورانہ امور کے بارے میں معلومات کی فراہمی کا اہتمام کیا گیا ہے۔

زندگی کے ابتدائی دور میں انسان کے بارے میں تمام فیصلے اس کے والدین یا سرپرست کرتے ہیں۔ ڈھائی تین برس کی عمر میں جب بچہ اپنی زندگی میں پہلی بار مدرسہ جاتا ہے تو مدرسہ کے انتخاب کا فیصلہ اس کے والدین کا ہوتا ہے۔ بچے کی زندگی کے اس بالکل ابتدائی مرحلے سے ہی اس کی شخصیت اور مزاج ایک خاص انداز میں ڈھلنا شروع ہوجاتا ہے' جو بتدریج پختگی کی سمت بڑھتا رہتا ہے۔ گھر میں موجود افراد' ان کا رویہ' باپ کا پیشہ' خاندان کے افراد کے باہمی تعلقات' مدرسہ میں استاد یا استانی کی شخصیت' ان کا برتاؤ' ہم جماعت بچوں کے ساتھ تعلقات' دوستی..... یہ تمام باتیں بچے کی شخصیت سازی میں شریک ہوتی ہیں۔

ابھی پچیس' تیس سال پہلے تک گھروں میں یہ رواج عام تھا کہ بچہ دو تین برس کا ہوتا تو اسے قرآن مجید کی تعلیم کے لئے پڑھنے بٹھا دیا جاتا تھا' "بسم اللہ" یا اقراء کی تقریب اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی تھی اب عام طور پر ڈھائی تین سال کی عمر میں بچے کو کنڈر گارٹن بھیجنا پسند کیا جاتا ہے۔ بیشتر گھرانوں میں دونوں سلسلے ساتھ ساتھ جاری رکھے جاتے تھے۔

تعلیم کے اس دور میں بچہ..... اپنے ماحول سے اور دنیا سے واقف ہوتا ہے نئی باتیں سیکھتا ہے۔ اپنی دلچسپیوں اور پسند و ناپسند کا اظہار کرتا ہے اور یہاں اس کی جسمانی توانائیاں اور ذہنی صلاحیتیں تعلیمی سرگرمیوں اور غیر نصابی دلچسپیوں کی صورت میں اظہار کے راستے پاتی ہیں۔

یہ وہ مرحلہ ہے جب گھر پر بچے کو مشاہدے اور تجربے کے ذریعہ زندگی میں کام کی اہمیت سمجھائی جاسکتی ہے۔ معاشرے میں کاموں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کے تعین کا احساس دلایا جاسکتا ہے تاکہ وہ عمر کے ابتدائی مرحلے میں ہی بات اچھی طرح سمجھ لے کہ کام زندگی کا حصہ بلکہ یہی زندگی ہے۔ کاموں کی تقسیم کیوں ضروری ہے اور ہر کام..... خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو ..... کیوں اور کس قدر اہم ہے۔

ابتدائی مدرسہ کی تعلیم کے زمانے میں اساتذہ اور والدین کے درمیان وقتاً" فوقتاً" ملاقات

ہوتے رہنا چاہئے تاکہ والدین بچے کی تعلیمی ترقی کی رفتار سے آگاہ رہیں اور استاد ان مسائل کے بارے میں گفتگو کر سکے جو طالب علم کی تعلیمی ترقی کی راہ میں پیدا ہو رہے ہیں۔

ابتدائی مدرسے کے بعد ثانوی مدرسہ ..... بچے کی تعلیمی زندگی کا تیسرا اور اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ عمر کے اس دور میں شعور پختگی کے بالکل ابتدائی مرحلے پر پہنچ رہا ہوتا ہے۔ ثانوی مدرسہ کی زندگی کے آخری دور میں خود اس کے جسم اور ذہن میں تبدیلیاں آرہی ہوتی ہیں۔ جوش و جذبات کا تند سیلاب اس کی شخصیت کو سیمابی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے۔ استاد' والد' یا خاندان کے کسی اور فرد یا قومی زندگی کی کسی اہم شخصیت' کسی رہنما' کھلاڑی یا ادارہ کو اپنا آئیڈیل بنا کر وہ اس جیسی زندگی گزارنے کی تمنا کرتا ہے۔ اس مرحلہ پر اساتذہ اور والدین کے ساتھ دوستوں کی رائے بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اپنے مسائل کے بارے میں دوستوں سے بھی گفتگو کرتا ہے۔ نوعمری کا یہ دور اپنے ساتھ متعدد تعلیمی' سماجی اور نفسیاتی مسائل لے کر آتا ہے۔ اس مرحلے پر نوجوانوں کو ایک ایسے ہمدرد شخص کی ضرورت ہوتی ہے' جس پر وہ اعتماد بھی کر سکیں اور جو مسائل کے حل کے لئے انہیں ہمدردانہ مشورے بھی دے سکے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اسکولوں میں طالب علموں کی اس قسم کی رہنمائی کے لئے کونسلر ہوتا ہے جو ہر طالب علم کا دوست بھی ہوتا ہے اور رہنما و مشیر بھی۔ ہمارے یہاں فی الحال اس قسم کا کوئی انتظام نہیں ہے جب کہ مدارس میں "مشیر طلباء" کی شدید ضرورت ہے۔ نوعمری کے اس دور میں بروقت اور صحیح رہنمائی و مشورہ نہ ملے تو نوجوان کی شخصیت میں بعض الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں جو عملی زندگی میں انہیں دشواریوں اور بعض اوقات ناکامی سے دوچار کر سکتی ہیں۔

ثانوی مدرسہ میں زیر تعلیم طالب علم جب آٹھویں جماعت کے امتحان میں کامیاب ہو جائے تب یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ اس کے لئے ثانوی جماعتوں کے مضامین کیا ہونے چاہئیں مدرسوں میں تعلیمی رہنمائی و مشاورت کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے طالب علم' مضامین کا انتخاب۔ گھر کے بزرگوں کے دباؤ اور کبھی کبھی ہم سبق دوستوں کی رائے سے متاثر ہو کر کرتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی میں اچھے نمبر حاصل کرنے والے سائنس گروپ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور باقی طلباء کو جنرل گروپ میں داخلہ دے دیا جاتا ہے۔ طلباء کے والدین کو یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ

آٹھویں جماعت کے بعد فنی تعلیم کی کسی درس گاہ میں بھی داخلہ مل سکتا ہے اور بعض مخصوص اداروں میں خصوصی تعلیم کے مواقع بھی میسر ہوتے ہیں۔

دسویں جماعت کا امتحان طالب علم کے لئے نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اب تک کی زندگی میں کسی اور امتحان کو اس قدر اہمیت نہیں دی جاتی ہے' اس لئے اس کا نتیجہ طالب علم کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

عملی زندگی کے لئے کونسا پیشہ اختیار کیا جائے؟ اس سوال کا جواب بارہویں جماعت کے بعد تلاش کرلینا چاہئے۔

بیشتر لوگ یہ فیصلہ شعوری طور پر خود نہیں کرتے بلکہ حالات کا دھارا انہیں جس سمت بہا کر لے جائے' وہ اسی دھارے کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حالات نے آپ کو ایسے پیشے سے منسلک کردیا ہو جو آپ کی صلاحیتوں' تعلیم' تجربے اور میلان طبع کے مطابق ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنی پسند کے مطابق کام نہ ملے اور آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بعد آپ ذہنی اور جسمانی طور پر ضرورت سے زیادہ تھکن محسوس کرتے ہوں۔ کام ایک مشغلہ نہیں بلکہ آپ کے لئے بوجھ ثابت ہوتا ہو۔

انسان کو زندگی میں کام ہی کرنا ہوتا ہے اگر یہ کام اس کی دلچسپی کا نہ ہو تو اس کا ذہن اور جسم اپنی توانائیوں کو جلد کھو بیٹھتے ہیں اس کے برخلاف' کام' ذہنی رجحان اور دلچسپی کا ہو تو پھر وہ شوق بن جاتا ہے اور آدمی جتنا وقت چاہے اس کام میں مصروف رہے' وہ تھکن محسوس نہیں کرتا۔ اسی لئے پیشے کا انتخاب ایک اہم فیصلہ ہوتا ہے اور بارہویں جماعت کے بعد جب آپ آگے تعلیم کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ مستقبل میں اپنے پیشے کے بارے میں آپ کا ذہن بالکل واضح ہو۔

بارہویں جماعت کے بعد کی تعلیم دراصل پیشہ ورانہ تعلیم ہوتی ہے۔ جس پر آپ کے مستقبل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ انجینئرنگ' بزنس ایڈمنسٹریشن اور دیگر مختلف شعبوں کی پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے مخصوص اداروں میں داخلے کی جستجو ہوتی ہے۔ گریجویشن کے خواہش مند تیرہویں جماعت کے لئے کالج یا جامعہ (یونیورسٹی) میں داخلہ لیتے ہیں۔

میڈیکل کالج میں جانے والے طلباء کو پانچ سال کا نصاب مکمل کرنا ہوتا ہے جس کی تکمیل کے بعد وہ میڈیکل کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کے لئے مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے کوشش کرسکتے ہیں۔ لیکن انجینئرنگ کے شعبہ کو اپنانے والے نوجوانوں کے لئے بارہویں جماعت کے بعد ہی یہ سوچنا اور انتخاب کرنا ضروری ہے کہ وہ انجینئرنگ کے کس شعبہ کو پسند کرتے ہیں اور کس میں اپنا کیریئر بنانا چاہتے ہیں۔ انجینئرنگ کی متعدد شاخیں ہیں۔ الیکٹریکل، میکنیکل، سول، الیکٹرونکس، میرین، آٹو موبائل، کیمیکل، ایرواسپیس یا ایرونائٹیکل، نیوکلیئر، سرامک، پیٹرولیم، میٹالرجی وغیرہ۔ اس موقع پر انجینئرنگ کے صحیح شعبہ کے انتخاب کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کے سامنے مختلف شعبوں کی صورتحال موجود ہو۔ مثلاً انجینئرنگ کی اس شاخ کا جس میں طالب علم کی دلچسپی ہے مختصر تعارف، اس پیشہ کے حالات کار، اندرون ملک یا بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے مواقع، مستقبل میں اس شعبوں کے ماہرین کی ضرورت کا اندازہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی اس قسم کی معلومات موجود ہوں تاکہ اگر تفصیلات جاننے کے بعد ایک نوجوان اس شعبہ کو اپنے لئے موزوں نہ سمجھے تو اس کے لئے متبادل انتخاب موجود ہو۔ ..... مثلاً" ہوسکتا ہے کہ ایک نوجوان کو میکنیکل انجینئرنگ کے شعبہ سے دلچسپی ہے لیکن جو معلومات اس نے حاصل کیں اس سے اندازہ ہوا کہ بیشتر میکنیکل انجینئروں کو شفٹوں کی ملازمت کرنا پڑتی ہے اور وہ نوجوان شفٹوں میں کام کرنا پسند نہیں کرتا تو وہ کسی دوسرے شعبے میں جستجو کرسکتا ہے۔ دوسرے شعبوں کی معلومات حاصل کرتے ہوئے اس کو پتا چلتا ہے کہ ۵ سال بعد ملک میں اسٹیل مل قائم ہونے والا ہے۔ جس کے لئے بڑی تعداد میں میٹریل اور میٹالرجی انجینئروں کی ضرورت ہوگی ..... اس لئے جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے گا تو تھوڑے ہی عرصہ بعد روزگار کے نمایاں مواقع موجود ہوں گے ..... اگر وہ چاہے تو ان معلومات کی بناء پر اپنے لئے میٹالرجی یا دیگر کسی متعلقہ شعبے کا انتخاب کرسکتا ہے۔

کوئی طالبہ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتی کہ عمارت کی تعمیر کی نگرانی کرے، موسم کی سختیوں میں کام کرے یا محنت طلب میکنیکل انجینئرنگ کے شعبہ میں داخل ہو۔ لیکن وہ یہ دیکھتی ہے کہ الیکٹرونکس اور کمپیوٹر ایسے شعبہ ہیں جہاں ان تمام ناپسندیدہ

حالات کار کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور صاف ستھرے ماحول میں نازک مشینوں سے واسطہ ہو گا ..... ان معلومات کی بناء پر وہ الیکٹرونکس کے شعبہ کا انتخاب کر سکتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں نشستیں محدود تعداد میں ہوتی ہیں جب کہ ہر سال ہزاروں نوجوان اعلیٰ ثانوی امتحان (انٹرمیڈیٹ) کامیاب کرتے ہیں۔ اول درجہ میں کامیاب متعدد نوجوانوں کو انجینئرنگ، میڈیکل یا دوسرے پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں داخلہ نہیں مل پاتا جس کی وجہ سے وہ مایوسی کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی عملی زندگی کے لئے جس پیشے کو انہوں نے مقصد بنایا تھا اس کے حصول میں وہ ناکام رہے ہیں ..... اس احساس کی بنیاد لاعلمی ہوتی ہے کیونکہ بی۔ ای یا ایم بی بی ایس کی سند ہی کسی پیشہ میں کامیابی کا راستہ نہیں ہے میڈیکل سائنسز میں کیریئر بنانے کے خواہش مند نوجوانوں کے لئے ایم بی بی ایس کے علاوہ کئی اور راستے کھلے ہوتے ہیں وہ بی ڈی ایس (دانتوں کی طب کے علم کی سند) کر سکتے ہیں، فارمیسی کو اختیار کر سکتے ہیں، میڈیکل ٹیکنالوجی اور بیتھالوجی کے ذیلی شعبوں کو اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح انجینئرنگ یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ سے محروم رہ جانے والوں کے لئے بھی کئی راستے ہوتے ہیں مثلاً" بی ای کے بجائے بی ایس سی (انجینئرنگ) کر سکتے ہیں، کسی پولی ٹیکنک میں داخلہ لے سکتے ہیں، ڈپلومہ کی بنیاد پر کسی بیرونی تعلیمی ادارے میں داخلہ لے سکتے ہیں، بی ٹیک کر سکتے ہیں جہاں انہیں کئی مضامین کی چھوٹ مل سکتی ہے۔ لیکن یہ انتخاب اسی وقت ممکن ہے جب آپ کو مختلف پیشوں کے بارے میں بنیادی نوعیت کی معلومات کسی ایک جگہ دستیاب ہوں۔

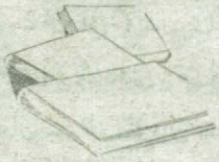

"علم"

- علم وہ پھول ہے جس سے ساری دنیا معطر رہتی ہے۔
- علم سمندر کے طرح ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔
- علم انسان کی تیسری آنکھ ہے۔
- علم ایک ایسا لباس ہے جو کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

خبط

عفیفہ اطہر

یہ میرے بھیا ہیں سرمد۔ یہ جو تصویر میں پیچھے سے پھول پھلواری نظر آرہی ہے ناں یہ انہوں نے خود لگائی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے۔ بہت شوق تھا ان کو بلکہ جنوں یا خبط تھا۔ بہت محبت کرتے ان سے اور بقول ان کے "پودے بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔" کیوں؟ ہوئی ناں حیرت آپ کو بھی۔

جب بھیا کالج میں تھے تو ایک دن بوٹنی (Botany) کے لیکچرار نے لیکچر کے دوران کہا کہ" جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ پودے بھی دوسرے جانداروں کی طرح اپنے احساسات رکھتے ہیں۔ان کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اگر ان سے محبت کی جائے تو اثر لیتے ہیں۔ پہلے کی نسبت صحت مند ہوجاتے ہیں..... کبھی تجربہ کرکے دیکھنا۔"

لیکچر کے بعد باقی اسٹوڈنٹس تو بھول بھال گئے لیکن بھیا گہری سوچ میں تھے۔پھر انہوں نے

تجربہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اگلے دن ہی قریبی نرسری سے پودے، گملے لے آئے۔لان کی صفائی کی۔ کہیں گلاب، چنبیلی، ربڑ پلانٹ، کلینڈم کیا کچھ اگا ڈالا۔ روزانہ باقاعدگی سے پانی دیتے۔ کاٹ چھانٹ سب کچھ خود سنبھال لیا۔ مالی چچا کو فارغ کردیا۔ پھر تو بھیا کے دوست، کرکٹ، اسنوکر سب کچھ چھوٹ گیا۔ دوست آتے، بے رُخا جواب پاکر جلد بور ہوجاتے۔کالج سے واپسی پر پہلے لان میں جاکر پودے دیکھتے، پھر کھانا کھاتے۔ دوست تو پہلے بھی کم تھے اب تو نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ تعلیم علیحدہ ڈسٹرب ہورہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ان میں زیادہ مگن رہنے لگے۔ دوست احباب منع کرتے، مذاق اڑاتے کیا کچھ نہیں کہتے۔مگر کچھ اثر ہی نہ ہوتا۔

ایک دن شام کو میں یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے لان میں جانکلی تو دیکھا بھیا گلاب کے پودے کے قریب جھکے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہے تھے۔"پتہ ہے آج میرا فزکس کا ٹیسٹ تھا۔ میری تیاری نہیں تھی۔کامران آگے بیٹھا تھا بہت کہا"دکھا دو ذرا مگر مانا نہیں۔کیسے دوست ہیں آج کل کے۔" میں ہنسنے لگی۔"بھیا! یہ کیا کررہے ہیں آپ۔"

انہوں نے مڑکر دیکھا۔"شش" انہوں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔"تمہیں افسوس ہوا ہے ناں۔" وہ اس سے مخاطب تھے۔

"بس کریں بھیا! یہ بھی کوئی بات ہے؟ اب اسے سمجھ آرہی ہوں گی آپ کی باتیں۔"

"خاموش۔" وہ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے "تم نے میرے دوست کی انسلٹ کی ہے۔ فوراً معافی مانگو۔"

"ہوں انسلٹ کی ہے معافی مانگو..... میرا دماغ خراب ہے کیا۔" میں نے تنک کر نقل اتاری اور چل دی۔ وہ دوبارہ وہیں بیٹھ گئے۔غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔"سوری تمہیں اس کے الفاظ سے تکلیف پہنچی۔" میں تاسف سے سرہلاتی امی کے پاس جا پہنچی۔

☆ --- ☆ --- ☆

"میرا خیال ہے کہ اسے کسی نفسیاتی اسپیشلسٹ کو دکھانا چاہئے۔ یہ تو روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔" ابو پریشانی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

"میرا یہی خیال ہے۔" امی بولیں۔

"مگر ابو....." بھیا نے بولنے کی کوشش کی۔

"تو پھر ٹھیک ہے پرسوں جمعرات ہے۔ میں دفتر سے جلد چھٹی لے آؤں گا۔ ڈاکٹر بھٹی کا کلینک قریب ہے۔" ابو نے سنی ان سنی کرتے ہوئے

کہا۔

"میں بیمار نہیں ہوں ابو۔ آپ کو میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آرہی۔ یہ پودے میرے دوست ہیں۔"

"صرف یہی رہ گئے تھے دوست بنانے کو؟" ابو نے گھورا۔

"ابو! آپ نہیں سمجھیں گے یہ ..... یہ پیار و محبت کے متلاشی ہیں۔"

"آپ کبھی مل کر تو دیکھیں ان سے۔" بھیا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بس کرو میاں صاحبزادے! اب میرا دماغ خراب مت کرو۔ کہہ دیا ہے ناں کہ ختم کرو یہ پاگل پن ورنہ لگتا ہے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہی پڑے گا۔"

"افوہ آپ سب کو کیا ہو گیا ہے؟"

"میاں! تمہیں ہی "کچھ" ہو گیا ہے۔"

"پیاری بہنا! تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ پریشان سے کمرے میں میرے پیچھے چلے آئے۔

"بھیا آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ آپ انسانوں میں ملیں گھلیں کیا آپ نے نباتات و جمادات کو پال لیا ہے؟"

"تم ..... تم بھی نہیں سمجھو گی۔ نہیں سمجھو گی۔" وہ چلے گئے۔

جمعرات کے دن ابو چھٹی لے کر آگئے۔ بھیا کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے ایک نہ سنی۔ ڈاکٹر صاحب نے دو گھنٹے کی تفصیلی ملاقات کے بعد ابو کو علیحدگی میں بلایا اور کہا۔

"یہ کوئی بیماری نہیں ہے آپ کے بیٹے کو۔ بس شوق کہہ لیں یا کچھ اور۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب! شوق ایک حد میں اچھا لگتا ہے۔"

"بالکل۔ بالکل میرا خیال ہے کہ ان کا کوئی دوست ایسا نہیں جو واقعتاً اس کے مسئلے سنتا ہو' انہیں شیئر کرتا ہو۔ یہ بھی بس توجہ چاہتا ہے شاید۔"

"لیکن ڈاکٹر! اتنے دوست ہیں اس کے کامران' رضا' عدنان' سہیل....."

"دیکھیں بھئی بات اتنی سی نہیں ہے۔ وہ ان سب دوستوں کے درمیان بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ آپ کے بچوں میں سب سے بڑا ہے۔ پہلے مکمل توجہ اور پیار اسے ملتا رہا۔ بعد میں دوسرے بہن بھائیوں میں یہ پیار بٹا۔ جو اس کا حساس دل قبول نہیں کر پایا۔ اب کسی کو وہ اپنی کوئی الجھن نہیں بتا پاتا کہ شاید اس طرح میرا مذاق اڑایا جائے گا۔"

"اب بھی تو مذاق اڑایا جارہا ہے۔" ابو کھوئے ہوئے لہجے میں بولے۔

"خیر! یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں جو حل نہ ہو سکے۔ یہ سب آپ کی محبت' شفقت کے ذریعے ممکن ہے۔ مکمل توجہ کے ساتھ۔"

"جی اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔"

"صرف آپ ہی نہیں بلکہ آپ کے سب گھر والے۔"

"اوکے۔ خدا حافظ۔"

☆ --- ☆ --- ☆

"یار کیا حال ہیں تمہارے اور دوستوں کے۔ آج کل یہ تمہارا گلاب کمزور سا لگ رہا ہے۔ خیریت! بیمار تھا شاید پچھلے دنوں؟" ابرار نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! اصل میں پچھلے دنوں ایگزامز کی وجہ سے نہیں آسکا تو ناراض تھا یہ مجھ سے۔" بھیا نے گہری سنجیدگی سے کہا تو سب کا قہقہہ پڑ گیا سرمد نے حیرانی سے انہیں دیکھا جیسے وجہ نہ سمجھ پارہا ہو ان کے کہنے کی۔

اب سرمد بھیا پینٹنگ بھی کرنے لگے تھے' کینوس کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے پھر شاہکار تخلیق ہوتے۔ لیکن اول سے آخر تک ان کی زندگی کا موضوع یہی بنتے جارہے تھے۔ قدرتی مناظر۔

ایک دن رات کو سوتے میں مجھے پیاس لگی تو مجبوراً" اٹھنا پڑا۔ صحن کی دوسری طرف واقع کچن میں جاتے ہوئے لان میں کسی کی سسکیوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ یہ سرمد بھیا تھے۔

"میرے دوست! میں تمہیں کیا کیا بتاؤں کشمیر جنت ارضی میں سب انسان چنار' درخت' کھیت کھلیان۔ سب کچھ جل رہا ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے' وہ مجھے پکار رہے ہیں' اپنے دوست کو اور میں یہاں بیٹھا ہوں مگر نہیں میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں بچاؤں گا انہیں میں ضرور کروں گا..... میں کچھ کروں گا ان کے لئے ....."

پھر معلوم نہیں کیسے سرمد بھائی نے مجاہدین سے رابطہ کیا اور اچانک وہاں چلے گئے۔ سب گھر والے حیران تھے کہ انہیں کیا سوجھی لیکن ابو نے کہا "چلو اچھا ہے کچھ تو دھیان بٹے گا اس طرف سے ورنہ یہاں رہ کر تو وہ مزید یکسانیت کا شکار ہوچکا ہوتا۔"

وہاں سے انہوں نے صرف دو خط بھیجے۔ ایک گھر والوں کے نام اور ایک اپنے ان "دوستوں" کے نام جو پڑھ کر سنانا میری ذمہ

تاریخ کے حیرت انگیز ڈوئل مقابلے

مارسیلز (فرانس) کے ہنری ٹریگنے ۱۸۷۸ء ..... ۱۸۶۱ء نے ڈوئل کی پانچ لڑائیاں لڑیں۔ ڈوئل کی ان پانچ لڑائیوں میں سے پہلی چار لڑائیوں میں اس کا ہر حریف، کوئی فائر ہونے سے پہلے ہی مر جاتا۔ پانچویں لڑائی میں ٹریگنے بھی اسی صورتحال سے دوچار ہوا اور اس سے پہلے کے وہ یا حریف کوئی گولی چلاتا، وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

تو تمہاری برادری کے اور دوستوں سے ملا ہوں۔ سب زخم رسیدہ، لہولہو ..... پوری وادی ہی لہو رنگ ہے۔ تم تو آزاد ہو ناں۔ یہ قیدی ہیں وقت کے قیدی۔ مگر ایک دن ضرور ان کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں گی۔ ضرور، انشاء اللہ۔ یہ انسان تو یہاں ان دوستوں سے بھی زیادہ ستم رسیدہ ہیں۔ کیا کیا بتاؤں بس تم دعا کیا کرو اپنے اللہ سے کہ وہ صبح آزادی کا سورج طلوع کرے۔

تمہارا

سرمد

ایک دن شام ڈھلے میں لان میں چہل قدمی کر رہی تھی تو ڈاکیا ایک خط ڈال گیا۔ خط کے پیچھے پتہ کشمیر کا تھا۔ میں نے بے تابی سے کھولا۔ مگر میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ یہ سرمد بھیا کی شہادت کی نوید لایا تھا۔ وہ اپنے قول، وعدے میں سچے نکلے۔ وہ امر ہو گئے تھے۔ اپنے دل کے ارمان نکال کر، کتنے ہی ظالموں کو تہہ تیغ کر کے مگر!!!

سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے روتے ہوئے جب لان میں جا کر وہ خط پڑھا تو اگلے دن ..... ہاں اگلے دن سب پودے مرجھا کر گر چکے تھے۔

داری ٹھہری۔ ویسے بھی بھیا جاتے وقت مجھے تاکید کر کے گئے تھے کہ روزانہ دو گھنٹے کم از کم لان میں میرے دوستوں سے گپ شپ لگانی ہے۔

روزانہ دو گھنٹے گزارنا تو ناممکن تھا لیکن دس پندرہ منٹ کے لئے ضرور جاتی تھی۔ بس کبھی کبھار یوں لگتا کہ اگر میں نہ گئی تو کہیں یہ میری شکایت نہ کر دیں بھیا سے۔

"افوہ لگتا ہے مجھ پر بھی اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔" فضول خیالات سے میں نے پیچھا چھڑایا۔ خط کا متن یہ تھا۔

"میرے دوستو! میں بہ خیریت ہوں۔ تمہاری خیریت کے لئے دعا گو ہوں یاد کرتے ہو ناں مجھے۔ میں تمہیں بھولا ہی کب ہوں۔ یہاں

درِ حیرت کھلتا ہے

اس امریکی لینڈ اسپیکر نے
فوکس ویگن پر گھاس اور
پھول پتے اُگا کر کار کا حلیہ
ہی بدل ڈالا۔
ہائے بے چاری فوکس ویگن

فرانس کے شہر لائینز کے قریب ۳۵ سالہ خاتون
"نکول ڈیورٹ" نے کسی حفاظتی تدبیر کے بغیر
ایک گھنٹہ فضائی غبارے کے ساتھ ایک ہاتھ سے
لٹک کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

سندربن کے جنگلوں میں خونخوار شیر آئے دن لوگوں کو
ہڑپ کر جاتے تھے۔ دیکھئے تو وہاں کے لوگوں نے شیروں کو
بیوقوف بنانے کی کیسی ترکیب نکالی۔ سر کی پشت پر ماسک
لگا دینے سے شیر سمجھ ہی نہیں پاتے کہ یہ لوگ آ رہے ہیں یا
جا رہے ہیں۔

اُسامہ بن سلیم

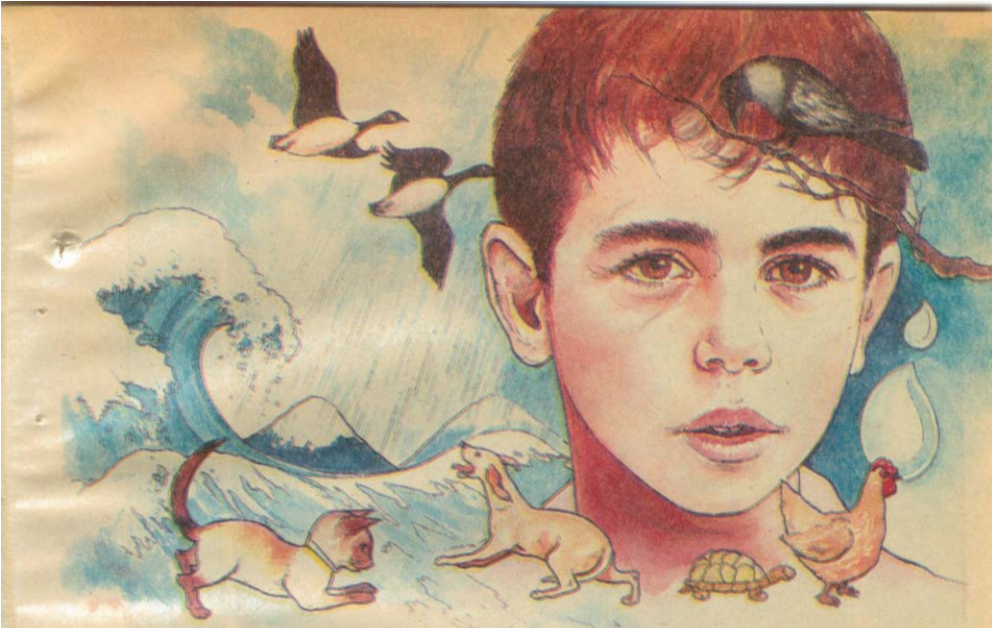

پانی کا سفر

احمد عاطف صدیقی

"شڑاپ" شمی کے منہ پر پانی کا ایک زور دار چھپاکا آکر پڑا اور وہ بھی بالکل اسی طرح منہ جھٹکنے لگی جس طرح کل مانو بلّی اپنا منہ اس وقت جھٹک رہی تھی۔ جب شریر گڈو نے اس کے منہ پر کُلّی کر ڈالی تھی۔

شمی کے منہ پر تو خیر انہوں نے اسٹیل کے کٹورے کا بچا ہوا پانی پھینک مارا تھا۔ مگر شمی کو اپنا منہ جھٹکتے دیکھ کر انہیں مانو بلّی کی کل والی حرکت یاد آگئی اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

گڈو کی ہنسی کی آواز سن کر شمی نے اپنی مندی ہوئی آنکھیں پٹ سے کھول دیں اور انہیں ہاتھ میں پیالہ تھامے پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستے دیکھا تو

ساری بات سمجھ گئی۔

"ٹھہرو! ابھی امی کو بتاتی ہوں۔" یہ دھمکی دے کر شمی نے وہیں سے آواز لگائی :

"امی!!"

"کیا ہے؟" امی نے باورچی خانے ہی سے جواب دیا۔

"دیکھئے! گڈو نے کٹورے کا سارا پانی میرے منہ پر پھینک دیا۔"

"گڈو!!!" پہلے امی کی غصہ بھری آواز آئی' پھر امی خود بھی وہیں آگئیں اور ڈانٹتے ہوئے بولیں :

"یہ کیا حرکت ہے؟ دماغ خراب ہوگیا ہے؟ جاہل کہیں کے!"

"امی! میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ مجھے جاہل تو نہ کہیں' آخر کلاس تھری میں پڑھتا ہوں۔"

گڈو میاں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے' امی سے احتجاج بھی کر ڈالا۔ دراصل انہیں اس بات سے بڑی چڑ تھی کہ انہیں کوئی "جاہل" کہے۔ وہ باقاعدہ یونیفارم پہن کر اسکول جاتے تھے' کلاس فیلوز اور ٹیچرز کے ساتھ شرارتیں (یا اپنے خیال کے مطابق مذاق) فرماتے تھے' اور طرح طرح کی شکایتوں کا تحفہ لئے گھر چلے آتے تھے۔ اکثر ان کے امی! ابو کو ان کے اسکول سے اس قسم کی شکایتیں ملتیں کہ :

"پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے۔"

"کلاس میں ہر وقت شرارتیں کرتے ہیں۔"

"ہوم ورک مکمل کر کے نہیں لاتے۔"

"وغیرہ وغیرہ۔ اوّل تو وہ امی ابو کو بتاتے ہی نہ تھے کہ انہیں اسکول سے ہوم ورک دیا گیا ہے۔ اور اگر کسی طرح امی ابو کو معلوم ہو جاتا تو وہ چاہتے تھے کہ ان کی طرف سے سارا کام امی یا ابو ہی کردیں۔

امی ابو کی سخت کوششوں کے باوجود انہوں نے پڑھائی لکھائی کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ہر مرتبہ جھنجھلا کر یہی کہا کرتے کہ :

"بس رہنے دیجئے۔ اگر مجھے کچھ نہیں آتا تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟"

امی سمجھاتیں کہ :

"بیٹا! ہمارا تو کوئی نقصان نہیں ہے' سارا نقصان تمہارا ہی ہے' تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی نہ بن سکو گے' جاہل کے جاہل رہ جاؤ گے۔"

"جاہل" کا لفظ سن کر انہیں اور بھی غصہ آجاتا اور کہتے کہ :

"ٹھیک ہے! اگر جاہل رہ جاؤں گا تو آلو

چھولے بیچنے والا بن جاؤں گا۔ سب آپ ہی کو آلو چھولے بیچنے والے کی امی کہیں گے۔ میرا کیا ہے؟"

امی کو ایسی باتیں سُن کر ہنسی آنے لگتی مگر وہ اپنی ہنسی کو زبردستی اپنے غصّے سے دباتے ہوئے کہا کرتیں کہ :

"بیٹا! عِلم صرف کمانے کے کام نہیں آتا۔ عِلم بہت بڑی نعمت ہے۔ عِلم ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی اگر آلو چھولے بیچے گا تب بھی جاہل سے بہتر ہی ہوگا۔" وغیرہ وغیرہ۔ مگر گڈو میاں کو تو بس ایک رٹ یہی لگ جاتی ہے کہ اسکول میں پڑھنے کے باوجود انہیں "جاہل" کیوں قرار دیا گیا۔ آج بھی انہوں نے تو محض مذاقاً" شمی پر پانی پھینکا تھا مگر امی نے اس مذاق پر انہیں .... "جاہل کہیں کے" .... کہہ دیا۔ اپنی حرکت پر شرمندہ ہونے کے بجائے وہ اُلٹا امی کے سر ہوگئے کہ :

"آخر آپ نے مجھے جاہل کہا کیوں؟!!!"

امی نے بھی جل کر جواب دیا کہ :

"تمہیں جاہل نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ پڑھنا نہ جانو، لکھنا نہ جانو، اور اُلٹی سیدھی حرکتیں کرو۔ اللہ کی نعمتوں کو ضائع کرو۔"

"اللہ کی نعمتوں کو؟!!!" گڈو میاں نے حیرت سے پوچھا کہ :

"کون سی نعمتوں کو؟"

امی نے جواب دیا کہ :

"اگر تم نے اپنی کلاس کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپی لی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا کہ پانی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ پانی کہاں سے چلنا شروع ہوتا ہے اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا تمہارے اس کٹورے تک پہنچتا ہے، جس سے تم نے اسے شمی کے منہ پر پھینک مارا؟"

گڈو میاں نے صرف اپنا سر ہلادیا۔ انکار کے انداز میں انہیں اتنا تو معلوم تھا کہ پائپ سے پانی ان کے گھر کے ٹینک میں آتا ہے اور ٹینک سے نل میں۔ اس کے آگے انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ لہٰذا ان کو اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا ہی پڑا۔ انہیں "نہیں" کہنے کے انداز میں سر ہلاتے دیکھ کر امی نے غصّہ میں کہا :

"اسی لئے تو میں تمہیں جاہل کہتی ہوں۔"

امی تو یہ کہہ کر واپس باورچی خانے میں چلی گئیں، مگر گڈو میاں کے دل پر اس مرتبہ سچ مچ بڑی زبردست چوٹ پڑی تھی، کیوں کہ آج وہ

واقعی اپنے آپ کو "جاہل" محسوس کرنے لگے تھے۔

"آخر یہ پانی کہاں کہاں سے ہوتا ہوا آتا ہے؟"

یہی سوچتے سوچتے وہ پہلے تو بستر پر نیم دراز ہوئے، پھر سو گئے۔

"کیوں پریشان ہو گڈو میاں؟"

"گڈو کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی مانو بلی ان کی پریشانی دیکھ کر "میاؤں میاؤں" کر کے ان سے پریشانی کی وجہ پوچھ رہی ہو۔

"سوری مانو..... میں نے کل تمہارا منہ بھی بھگا دیا تھا۔ مجھے معاف کردو۔ مگر کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ٹینک میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

گڈو میاں نے مانو سے معذرت کے بعد یہ سوال کیا تو وہ بولی کہ :

"کوئی بات نہیں گڈو میاں۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، یہی بہت ہے۔ بھئی میں تو آپ کے گھر میں رہتی ہوں، مجھے تو معلوم نہیں کہ آپ کے ٹینک میں پانی کہاں سے آتا ہے، مگر میں آپ کے لئے کسی سے معلوم کرلوں گی۔"

گڈو میاں سے وعدہ کر کے بلی باہر نکلی اور دروازے پر بیٹھ گئی۔

ہمسایوں کی مرغی اپنے درجن بھر بچوں کا قافلہ لے کر "پق، پقاق ..... پق پقاق" کرتی انہیں ڈانٹتی پھٹکارتی وہاں سے گزری تو بلی نے اسے آواز دی :

"السلام علیکم، مسز ککڑوں کوں! بھئی کیا حال ہیں؟"

مسز ککڑوں کوں نے وہیں سے رُک کر جواب دیا :

"وعلیکم السلام۔ اللہ کا شکر ہے، مزے سے گزر رہی ہے۔ تم کیسی مس مانو؟"

مانو نے جواب دیا کہ :

"ٹھیک ہوں ..... ارے! مسز ککڑوں کوں! آپ سودا سلف لینے کے لئے بڑی دور دور تک چلی جاتی ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پانی کے پائپ سے ہمارے ٹینک میں جو پانی آتا ہے وہ کہاں سے آتا ہے؟"

مسز ککڑوں کوں بولیں کہ :

"بھئی وہ سڑک کے کنارے ایک حوض سا بنا ہوا ہے، اس کے اندر ایک ہینڈل لگا ہوتا ہے، پانی والے روز آکر اس ہینڈل کو کھول دیتے ہیں، اسی سے تمہارے پائپ میں پانی آجاتا ہے۔ میں نے یہی دیکھا ہے۔"

"واہ!" مانو کو یہ معلومات حاصل کر کے

خوشی ہوئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی کہ :

"مگر وہاں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"مسز ککڑوں کوں نے جواب دیا کہ :

"یہ تو مجھے نہیں معلوم ..... اچھا میں کسی سے معلوم کر کے بتادوں گی۔"

مسز ککڑوں کوں آگے گئیں تو انہیں ایک کوا اسی حوض میں چونچ ڈال کر ہینڈل سے ٹپکنے والا پانی پیتا نظر آیا۔ انہوں نے اسے پکار کر سلام کیا اور کہا کہ :

"سیانے بھائی! تم تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوئے ہو، تم کو ضرور معلوم ہوگا کہ یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟" کوے نے سینہ پھلا کر جواب دیا کہ :

"یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک خوب اونچی سی ٹنکی بنی ہوئی ہے، اس بستی کے ہر علاقہ میں پانی وہیں سے آتا ہے۔"

مُرغی یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ پھر کچھ خیال آتے ہی اس نے پوچھا کہ :

"اس اونچی سی ٹنکی میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

کوا بولا کہ :

"یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں ..... اچھا میں انکوائری کر کے تمہیں بتادوں گا۔"

کوا وہاں سے اُڑا تو اتفاق سے اسے مُرغابیوں کا ایک غول اڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ لپک کر اس غول کے پیچھے پیچھے ہولیا اور اُڑتے ہی اُڑتے اس نے سب سے پیچھے اُڑنے والی مُرغابی سے سلام دُعا کر کے پوچھا کہ :

"بی مُرغابی! تم تو نگر نگر اور ڈگر ڈگر پھرتی ہو ماری ماری۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس اونچی ٹنکی میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"معلوم ہے لیکن تجھ جیسے بدتمیز کو ہرگز نہیں بتاؤں گی۔ تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ خواتین سے کیسے بات کی جاتی ہے؟"

اب کوے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے کہا :

"معاف کیجئے بی مُرغابی! میرا مطلب تھا کہ آپ نے تو خوب سیر و سفر کیا ہے، آپ کو ضرور سب کچھ معلوم ہوگا۔ اب مہربانی کر کے غصہ تھوک دیجئے اور مجھے بتادیجئے!"

بی مُرغابی نے بتایا کہ :

"یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک واٹر ہیڈ ورکس ہے، وہاں ایک جھیل میں سے پانی آتا ہے۔ جو صاف کر کے اس اونچی ٹنکی میں پہنچا دیا

جاتا ہے۔"

کوے نے بی مُرغابی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا کہ :

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس جھیل میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

مُرغابی نے بتایا کہ :

"جھیل میں تو دریا سے آتا ہے!"

اب کوے نے پوچھا :

"دریا میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

مُرغابی بولی کہ :

"بھئی یہ بات تو مجھے نہیں معلوم۔ اگر کل تم یہیں ملو تو میں سب کچھ معلوم کر کے بتادوں گی۔"

مُرغابی اگلے روز دریا پر مچھلی پکڑنے گئی تو اس کی ملاقات ایک کچھوے سے ہوگئی جو دریا میں تیراکی کرنے کے بعد باہر نکل کر سیر سپاٹا کر رہا تھا۔ مُرغابی نے پوچھا کہ :

"ٹرٹل بھائی ..... ٹرٹل بھائی، اس دریا میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

ٹرٹل بھائی نے ذرا سا رُک کر جواب دیا کہ :

"بہت دور پہاڑوں کے اوپر ایک چشمہ ہے، جو اس دریا کا "سرچشمہ" کہلاتا ہے، یہ سارا پانی وہیں سے آتا ہے!"

اب مُرغابی نے یہ پوچھا کہ :

"اس چشمہ یا سرچشمہ میں اتنا پانی کہاں سے آجاتا ہے کہ یہ دریا ہر وقت موجوں ہی مارتا رہتا ہے۔"

کچھوے نے جواب دیا کہ :

"بھئی میں نے سُنا ہے کہ بہت اونچے پہاڑوں پر جو برف جمی ہوئی ہوتی ہے، اس کے بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جو گلیشیئر کہلاتے ہیں، یہی گلیشیئر پگھلتے ہیں تو وہ چشمہ سے نکلنے والے پانی کو اتنا بڑھادیتے ہیں کہ دریاؤں میں سیلاب بھی آجاتا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ ٹرٹل بھائی۔" مُرغابی نے کہا۔ پھر یکایک اس نے پوچھا کہ :

"ٹرٹل بھائی! بارش کا پانی بھی تو برفانی پہاڑوں پر گرتا ہے اور دریاؤں کی سطح کو بڑھاتا ہے۔ تو آخر یہ بارش کا پانی کہاں سے آتا ہے؟"

کچھوا بولا کہ :

"صاف ظاہر ہے کہ بادلوں سے آتا ہے اور بادلوں کو ہوا لے کر آتی ہے۔ کہاں سے لاتی ہے؟" میں نے تو نہیں دیکھا مگر اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ سمندر سے لاتی ہے۔ اب تم

پوچھو گی کہ وہ کس طرح؟ تو بھئی یہ بات مجھے معلوم نہیں مگر میں کسی سے پوچھ کر تمہیں بتادوں گا۔"

کچھوا یہ کہہ کر دریا کے کنارے اُگے ہوئے ایک درخت کی چھاؤں میں آرام کرنے لگا اور مُرغابی مچھلیاں پکڑ کر انہیں کھانے چلی گئی۔

درخت نے ساری باتیں سُن لی تھیں۔ اس نے کچھوے کو بتایا کہ :

"ہوا ان بادلوں کو سمندر سے اُڑا لاتی ہے۔ جب گرمی یا سخت سردی کے دن آتے ہیں تو سمندر سے پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے اور اوپر پہنچ کر بادل بن جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا انہیں ہر اس جگہ اُڑا لے جاتی ہے' جہاں اسے برسنا ہوتا ہے۔"

کچھوے نے بھی درخت کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ :

"سمندر میں پانی کہاں سے آتا ہے؟"

درخت نے جواب دیا کہ :

"اوّل تو پہلے پہل یہ ساری زمین ہی سمندر تھی اور اب بھی زمین پر تین حصّے سمندر ہے اور ایک حصّہ خشکی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بھی تو سوچو کہ آخر یہ دریا کا پانی کہاں جاتا ہے؟ سمندر ہی میں تو گر جاتا ہے!"

"بھئی واہ! کچھوے نے حیرت سے کہا کہ :

"یہ تو پورا ایک دائرہ بن گیا۔ سمندر سے بھاپ' بھاپ سے بادل' بادل سے بارش کا پانی دریا میں گرتا ہے اور دریا سے سمندر میں جا گرتا ہے ..... لیکن سمندر کا پانی تو نمکین ہوتا ہے۔ اور دریا کا میٹھا۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

درخت نے جواب دیا کہ :

"بھئی جب پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے تو نمک سمندر میں رہ جاتا ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام اس لئے کیا ہے کہ یہ پانی پینے کے قابل ہو سکے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ" کچھوے نے کہا۔ اور پھر یہ تمام باتیں مُرغابی کو بتادیں مُرغابی نے کوے کو بتائیں کوے نے مُرغی کو' مُرغی نے مانو بلی کو اور جب مانو بلّی نے پوری تفصیل سے یہ سارا قصّہ گڈو کو سنایا تو مارے حیرت کے اس کی آنکھ ہی کھُل گئی۔ گڈو نے سوچا کہ :

"ایک پیالہ پانی بھی ..... جسے ہم بڑی آسانی کے ساتھ جگ سے انڈیل لیتے ہیں' فرج کی بوتل میں سے نکال لیتے ہیں' مٹکے' صراحی' یا نل سے بھر لیتے ہیں' صرف ہاتھ بڑھا کر..... وہ اتنی آسانی

سے تو ہم تک نہیں پہنچ جاتا.... کتنا لمبا سفر طے کر کے آتا ہے..... اللہ تعالیٰ نے کتنی چیزوں کو ہم تک ہمارے ہونٹوں اور منہ تک پانی پہنچانے کے لئے کام پر لگا دیا ہے۔ مگر ہم لوگ اللہ کا شکر نہیں ادا کرتے۔ شاید اس لئے کہ ہمیں ..... "عِلم" ..... نہیں۔ امی سچ کہتی ہیں کہ عِلم بڑی نعمت ہے۔"

پھر یکایک گڈو میاں کو خیال آیا کہ :

"پانی ہی کی طرح "عِلم" نے بھی تو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کیا ہے۔ ہر وہ بات جو پہلے پہل کسی ایک کو معلوم ہوئی اس نے دوسروں تک پہنچائی تب جا کر ہم تک "عِلم" پہنچا۔ لیکن اگر ہم خود ہی عِلم حاصل نہ کریں تو دوسروں تک کیسے پہنچائیں گے؟ اور اگر ہم دوسروں تک عِلم نہ پہنچائیں تو ہمارا عِلم بڑھے اور پھیلے گا نہیں ..... اس گندے پانی کی طرح ایک جگہ رُکا رہے گا جو کسی گڑھے میں پڑا رہتا ہے اور باہر نہیں نکل سکتا!!"

●●

علم کے موتی

عبدالقدیر فراز اجمل شوہاز، عیسیٰ پنجگوری

۱۔ جو شخص علم میں کمال حاصل کرنے اور نیک کردار بننے کا خواہش مند ہو۔ اسے جہالت کی باتوں اور بدکرداری کے قریب ہرگز نہ جانا چاہئے۔ (حضرت ادریسؑ)

۲۔ جو علم کو دنیا کمانے کے لئے حاصل کرتا ہے، علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔ (حضرت امام ابوحنیفہؒ)

۳۔ علم سے محبت کرنا دانش سے محبت کرنا ہے۔ (افلاطون)

۴۔ آدمی کا بہترین معلم تجربہ ہے اور زندگی کی ٹھوکریں اعلیٰ ذریعۂ تعلیم۔ (اڈمنڈا اسپنسر)

چھکے لگا کر چھکے چھڑانے والا

شاہد آفریدی

انٹرویو: عمران خالق

12 اپریل سنہ 1996ء کا دن کرکٹ کی تاریخ میں اس لحاظ سے یادگار تھا کہ سری لنکا کے اوپنر جے سوریا نے بھارت کے اظہر الدین کا 62 گیندوں پر تیز ترین سینچری کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ جے سوریا نے یہ ریکارڈ 48 گیندوں پر سینچری مکمل کرکے توڑا۔ سنگاپور میں کھیلے جانے والے اس میچ میں پاکستان اور سری لنکا کی ٹیمیں شامل تھیں۔ دنیائے کرکٹ توقع کررہی تھی کہ جے سوریا کا یہ ریکارڈ شاید اب کبھی نہیں ٹوٹے گا لیکن 4 اکتوبر سنہ 1996ء کا دن کرکٹ کی تاریخ کو ایک نیا اور یادگار سسپنس دے گیا۔ ایک سولہ سالہ لڑکے نے جے سوریا کے ریکارڈ کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس نے صرف 37 گیندوں پر سینچری مکمل کرلی۔ اس نے اپنی اننگ میں 11 چھکے مارے۔ یہ بذات خود ایک ریکارڈ ہے اور اس کم عمری میں سینچری بنانے کا جو ریکارڈ ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

کرکٹ کی دنیا میں اس نو عمری میں ہلچل مچا دینے والا یہ کرکٹر پاکستانی ہے۔ جس کا نام جی ہاں آپ بالکل ٹھیک سمجھے، شاہد آفریدی ہے۔ شاہد کی کارکردگی کا یہ یادگار میچ "فورنیشن کپ" کے سلسلے میں کینیا کے شہر نیروبی میں کھیلا گیا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے ٹیمیں اس دفعہ بھی پاکستان اور سری لنکا کی تھیں۔ آنکھ مچولی کے نوجوانوں کو اس یادگار میچ کے ہونہار سے متعارف کروانے کے لئے ہم پہلی فرصت میں گلشن اقبال کراچی جا پہنچے جہاں شاہد آفریدی کی رہائش گاہ ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ جانتے ہیں چنانچہ اب آپ سوال پڑھئے، جواب پڑھئے اور شاہد آفریدی سے ملاقات کا لطف اٹھائیے۔

سوال : "آپ کو کرکٹ کھیلنے کا شوق کیسے ہوا؟"

جواب : "میرے بڑے بھائی طارق آفریدی کرکٹ کھیلا کرتے تھے ان کو دیکھ کر مجھے بھی کرکٹ کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔"

سوال : "اکثر بچوں کے کھیلوں میں حصہ لینے پر گھر والوں کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ آپ کے ساتھ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا؟"

جواب : "مسئلہ تھا جناب! مجھ پر گھر والوں کی جانب سے کرکٹ کھیلنے پر بہت سختی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کھیل کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہئے۔ البتہ میرے بڑے بھائی طارق آفریدی نے اس سلسلے میں میری بہت حوصلہ افزائی کی۔"

سوال : "آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟ اور ان دنوں آپ کیا کر رہے ہیں؟"

جواب : "میں نے میٹرک ابراہیم علی بھائی اسکول فیڈرل بی ایریا سے کیا ہے۔ اور ان دنوں میں اسلامیہ سائنس کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔"

سوال : "جب آپ پاکستان انڈر ۱۹ کی ٹیم کی طرف سے ویسٹ انڈیز میں میچ کھیل رہے تھے تو اس وقت کیا آپ کو امید تھی کہ آپ کو یوں اچانک کینیا میں چار ملکی ٹورنامنٹ کے لئے بلالیا جائے گا؟"

جواب : "نہیں جی! اس وقت تو مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ مجھے اچانک مشتاق بھائی (جو کہ فٹ نہیں تھے) کی جگہ مجھے بلالیا جائے گا۔"

سوال : "جب آپ کو پتا چلا کہ آپ کا نام پاکستانی ٹیم میں آگیا ہے اور آپ کو کینیا بھیجا جارہا ہے۔ تو اس وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟"

جواب : "ہر کھلاڑی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کی ٹیم کی نمائندگی کرے۔ اس کے لئے وہ ڈومیسٹک کرکٹ میں پرفارمنس دیتا رہتا ہے۔ جب مجھے پتا چلا کہ میرا نام پاکستانی ٹیم میں آگیا ہے تو ظاہر ہے کہ مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

سوال : "ورلڈ چیمپئن سری لنکا جیسی مضبوط ٹیم کے خلاف میچ کھیلتے ہوئے کیا یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ آپ ورلڈ ریکارڈ توڑ دیں گے؟"

جواب : "نہیں پہلے سے تو یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی۔ البتہ میں نے رات خواب میں دیکھا تھا کہ میں سری لنکن بولرز پر چھکے لگا رہا ہوں خدا کا شکر ہے کہ میرا خواب صحیح ثابت ہوا

اور اس کی اتنی اچھی تعبیر ملی۔"

سوال : "جب آپ کو ون ڈاؤن بیٹنگ کے لئے بھیجا گیا تو کیا آپ نے پہلے سے تیز بیٹنگ کے بارے میں سوچ لیا تھا؟"

جواب : "دراصل اس میچ میں ہمیں اپنا رن ریٹ بڑھانا تھا اور فائنل میں پہنچنے کے لئے زیادہ اسکور کرنا تھا۔ چنانچہ ہمیں تیز رنز اسکور کرنے کی ہی ضرورت تھی۔ مجھے ون ڈاؤن بھی اسی لئے بھیجا گیا تھا۔"

سوال : "جے سوریا جو پوری دنیا میں جارحانہ بیٹنگ کے لئے مشہور ہیں اور بڑے بڑے بولروں کی پٹائی لگا دیتے ہیں' ان کے دو اوورز میں آپ نے 43 رنز بنائے۔ آپ نے تو خود ان کی پٹائی کردی۔ کیا جے سوریا سے آپ کی کوئی پرانی دشمنی تھی؟"

جواب : "(ہنستے ہوئے) نہیں جی' ان سے میری دشمنی کیوں ہونے لگی۔ بس بیٹنگ کرتے ہوئے جے سوریا مجھے تو سب سے آسان بولر لگے۔ اسی وجہ سے میں نے ان کی گیندوں پر زیادہ رنز بنائے اور اپنی اننگز کے دوران گیارہ میں سے پانچ چھکے جے سوریا کی ہی بالنگ پر لگائے۔"

سوال : "جب آپ سینچری کے قریب تھے تو کیا یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ آپ ورلڈ ریکارڈ توڑ دیں گے؟"

جواب : "نہیں یہ بات بھی مجھے پہلے سے معلوم نہیں تھی جب میں آؤٹ ہو کر گیا تو مجھے پتہ چلا کہ میں نے تیز ترین سینچری کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔"

سوال : "سری لنکا کے خلاف ریکارڈ ساز اننگ کھیلنے کے بعد آپ کے کیا تاثرات تھے؟"

جواب : "ظاہر ہے کہ بہت خوشی ہوئی مجھے خوشی اس بات کی بھی تھی کہ میں نے اپنے سلیکشن کو درست ثابت کردیا اور ایک اچھی اننگ کھیلی جو کہ ٹیم کے کام آئی۔"

سوال : "بنیادی طور پر آپ کس قسم کی بیٹنگ پسند کرتے ہیں دفاعی یا جارحانہ؟"

جواب : "یہ تو صورتحال پر منحصر ہے کہ کس قسم کی بیٹنگ کرنی ہے ذاتی طور پر مجھے جارحانہ بیٹنگ پسند ہے۔"

سوال : "آئندہ میچز کے لئے آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

جواب : "انشاء اللہ آئندہ بھی اپنی اسی کارکردگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کروں گا اور اچھی سے اچھی پرفارمنس دے کو وطنِ عزیز کا نام روشن کرنے کی کوشش کروں گا۔" ●

پاپ میوزک

افتخار احمد حماد

خیال ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء میں پاکستان میں ۹۰ فیصد لوگ گلوکار ہوں گے اور پھر پاکستان دوسرے ملکوں کو یہ گلوکار ایکسپورٹ کیا کرے گا۔

پاپ میوزک کا والیم عموماً" اتنا اونچا ہوتا ہے کہ اکثر گمان گزرتا ہے کہ یہ بوڑھوں کے سننے کے لئے ہے۔ کیونکہ بوڑھے اونچا سنتے ہیں۔ پاپ میوزک گانوں کی خوبی یہ ہے کہ گانا سمجھ میں آئے یا نہ آئے' گانے والا سمجھ میں آرہا ہوتا ہے۔ پاپ میوزک سنا کم اور دیکھا زیادہ جاتا ہے۔ اچھل کود ہی سے پتا چلتا ہے کہ کچھ ہو رہا ہے جو کوئی اور کام نہ کرسکتا ہو وہ پاپ سنگر بن سکتا ہے۔

ایک پاپ سنگر کو کسی صاحب نے گھر میں محفل موسیقی پر بلایا۔ اس نے پوچھا "کیا سناؤں؟" تو انہوں نے جواب دیا۔" جو بھی سناؤ ہمیں تو ساتھ والا مکان خالی کروانا ہے۔"

ایک پاپ سنگر کے والد نے کہا "مجھے میرے بیٹے کے گانے سے بہت فائدہ ہوا۔"

دوسرے نے کہا "وہ کیسے؟ اس نے تو کبھی گھر سے باہر نہیں گایا۔" تو والد نے کہا۔

"اسی لئے تو مجھے ساتھ والا مکان آدھی قیمت پر مل گیا ہے۔"

ثابت یہ ہوا کہ آپ مکان خالی کروا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ آپ ۱۰ یا ۱۵ روز تک مسلسل اونچی آواز سے پاپ میوزک بجائیں۔ اگر پڑوسیوں میں ذرا بھی غیرت ہوگی تو مکان چھوڑ جائیں گے اور اگر آپ جیسے پاپ میوزک کے دلدادہ ہوں گے تو اور پکے ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ نسخہ آزمانے سے قبل ان کی پسند یا ناپسند ضرور معلوم کرلیں۔

کلاسیکل میوزک والے تو منہ اور ہاتھوں سے گاتے ہیں مگر یہ لوگ ٹانگوں سے گاتے ہیں۔ یہ ٹانگوں کو اس طرح آگے پیچھے حرکت دے رہے ہوتے ہیں جیسے کسی اناڑی گھوڑے کو میلے میں نچایا جارہا ہو۔

ایک دیہاتی ایک شہری کے گھر مہمان بنا۔ جب رات کو اس نے ٹی وی (T-V) پر ایک پاپ سنگر صاحب کو دیکھا تو انہوں نے دریافت کیا کہ "یہ کیا کر رہا ہے؟" تو جواب ملا "جناب یہ گانا گا رہا ہے۔" دیہاتی نے یہ سن کر کہا "اچھا! میں سمجھا کہ شاید اسے کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔"

بلوچستان میں کسی ایک جرگے نے ایک پاپ سنگر کو حکم دیا کہ وہ ہر رات ۲ گھنٹے قیدیوں کو موسیقی سنایا کرے۔ کسی نے پوچھا کہ "اسے کس جرم کی سزا دی گئی ہے؟" تو جرگے کے ممبران نے کہا۔ "یہ پاپ سنگر کی نہیں قیدیوں کی سزا ہے۔"

اسی طرح ایک بار کسی معروف شخصیت سے پاپ سنگر کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی گئی تو انہوں نے جواباً کہا۔

"میں ہدایت کی دعا کرتا ہوں۔ ان بھائیوں کے لئے جو ٹانگوں سے گاتے ہیں۔"

"پاپ میوزک" میں لفظ پاپ کے معنی "گناہ" کے ہیں۔ یہ ہندی کا لفظ ہے اب آپ خود ہی سوچ لیجئے جس لفظ کے معنی ہی گناہ ہیں وہ میوزک کیسا ہوگا۔

"پاپ میوزک" کے ستائے ہوئے ایک قلم کار کا ردعمل۔ ایڈیٹر کا قلم کار کی رائے سے نہ متفق ہونا ضروری نہیں۔

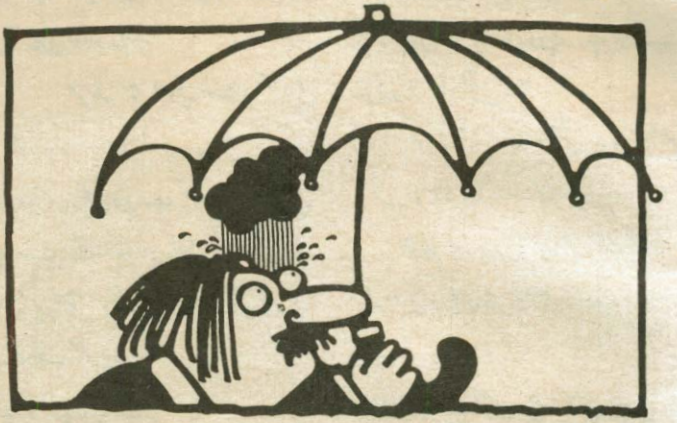

لطیفے شطیفے

جہاز پرواز کے لئے تیار تھا۔ ایک دیہاتی نے پائلٹ سے پوچھا "ڈرائیور جی آپ نے پیٹرول تو چیک کرلیا ہے؟"

پائلٹ : "ہاں ہاں ٹنکی فل ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

مسافر : "اس لئے کہ کہیں راستے میں پٹرول ختم نہ ہوجائے اور آپ ہمیں اتر کر دھکا لگانے کو کہہ دیں۔"

مرسلہ : صوفیہ سلطان، کراچی

بچے نے جاکر امی سے پوچھا۔

"امی! میں کیسے بنا؟ یعنی کیسے پیدا ہوا؟"

امی نے جواب دیا۔ "میں نے مٹی کو ایک برتن میں ڈالا اور مٹی سمیت برتن کو زمین میں دبا دیا۔ چند دنوں بعد اسے باہر نکالا تو اس میں تم تھے۔"

کچھ دنوں بعد بچے نے برتن میں مٹی ڈال کر اسے زمین میں دبا دیا۔ چند دنوں بعد اس نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں سے ایک مینڈک برآمد ہوا۔ بچے نے کہا۔

"جی تو چاہتا ہے میں تجھے گولی مار دوں، مگر کیا کروں تو میری اولاد ہے۔"

مرسلہ : صوفیہ سلطان، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب کافی دیر سے کپڑے کی دکان پر کپڑا دیکھ رہے تھے۔ وہ جو کپڑا دیکھتے اس کی گارنٹی بھی پوچھتے۔ دکاندار کپڑے کی گارنٹی بتاتے بتاتے تنگ آکر بولا۔

"آخر آپ کو خریدنا کیا ہے؟"

ان صاحب نے کہا "مجھے آدھا گز کاٹن اپنی ٹوپی کے لئے چاہئے۔"

دکاندار نے آدھا گز کپڑا دے دیا۔ صاحب نے اس کی گارنٹی پوچھی، دکاندار نے غصے سے جواب دیا۔ "جناب! آپ کا سر پھٹ جائے گا لیکن کپڑا نہیں پھٹے گا۔"

مرسلہ : عابد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک عورت دوپٹہ خریدنے کے لئے دکان میں گئی۔ دو گھنٹے تک وہ عورت دوپٹے لے کر اوڑھتی رہی اور ناپسند کرتی رہی۔ آخر ایک دوپٹہ اسے پسند آگیا۔ وہ دوپٹہ دکاندار کو دکھاتی ہوئی بولی۔ "بھائی ذرا یہ دوپٹہ پیک کردیں۔"

دکاندار بولا "بیگم صاحبہ! مجھے دوپٹہ پیک کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں آپ کو ایک بات بتاتا چلوں کہ یہ وہی دوپٹہ ہے جو آپ گھر سے اوڑھ کر آئی تھیں۔"

مرسلہ : عابد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

شوہر اور بیوی جلدی سے ایک پرچون والے کی دوکان میں داخل ہوئے اور دکاندار سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب ہمیں دیکھئے کونسی بیماری ہے؟"

دکاندار : "آنکھوں کی"

مرسلہ : عبدالقدیر فراز، شوہاز عیسیٰ پنجگوری۔

☆ --- ☆ --- ☆

اجمل طفیل سے : "یار کیسا رہا امتحان۔"

طفیل : "اس بار میرے نام کا حرف "ط" اُڑ گیا۔

مرسلہ : عبدالقدیر فراز، شوہاز عیسیٰ پنجگوری۔

☆ --- ☆ --- ☆

قدیر اجمل سے : "ذرا مار کر دکھانا۔"

اجمل اٹھا اور ایک تھپڑ قدیر کے منہ پر مارا۔

قدیر (غصے سے) : "یہ کیا حرکت ہے۔"

اجمل : "تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ مار کر

دکھانا۔"

قدیر : "بے وقوف! میں اس مارکر کی بات کر رہا ہوں جو تمہاری جیب میں ہے۔"

مرسلہ : عبدالقدیر فراز، شہباز عیسیٰ پنجگوری

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب کا لڑکا ہوسٹل میں رہتا تھا۔ انہیں یہ جاننے کی خواہش تھی کہ لڑکا ہوسٹل میں کس طرح رہتا ہے؟ چنانچہ ایک دن اسے اچانک ملنے کا پروگرام بنایا اور طویل مسافت طے کر کے رات کے ایک بجے ہوسٹل پہنچے۔ انہوں نے دروازے کے قریب جا کر دستک دی اور پوچھا "کیا پرویز یہیں رہتا ہے؟"

"ہاں" کمرے سے آواز آئی۔ "اسے اندر لے آؤ۔"

مرسلہ : محمد ریحان، اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

مریض : ڈاکٹر سے "جناب مجھے دور کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، بتایئے میں کیا کروں؟"

"قریب جا کر دیکھ لیا کرو ...." ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔

مرسلہ : عدیل دانش، لانڈھی کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

جج، مجرم سے : "کیا تم اپنے جرم کو تسلیم کرتے ہو؟"

مجرم : "نہیں حضور ..... وکیل صاحب نے میرے دفاع میں ایسی تقریر کی ہے کہ مجھے اپنی بے گناہی کا یقین ہو گیا ہے۔"

مرسلہ : عدیل دانش، لانڈھی کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

بیٹا باپ سے : "آج میں اسکول نہیں جاؤں گا، آپ مجھے چھٹی کی درخواست لکھ دیں۔"

باپ : "وہ کیوں؟"

بیٹا : "رات کی بارش کی وجہ سے سڑکوں پر بہت کیچڑ ہے۔"

باپ : "لیکن ..... درخواست دینے کون جائے گا؟"

بیٹا : "وہ تو میں خشک خشک راستہ دیکھ کر دے آؤں گا۔"

مرسلہ : عدیل دانش، لانڈھی کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

پڑوسن : "بیٹی آج کیا پکا رہی ہو؟"

نجمہ : "خالہ جان دال پکا رہی ہوں۔"

پڑوسن : مگر خوشبو تو تمہارے گھر سے مرغی کی آ رہی ہے؟"

نجمہ : "یہ اس لئے کہ آپ نے خود ہی تو ایک

دفعہ کہا تھا کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب نے نئی نئی کرکٹ کھیلنا شروع کی۔ جب ان کی بیٹنگ کی باری آئی تو ایک نہایت تیز رفتار باولر سے ان کو سامنا کرنا پڑا۔ وہ باؤلر پوری رفتار سے گیند کراتا رہا۔

وہ صاحب کسی ایک گیند کو نہ کھیل پائے اور نہ ہی انہوں نے کوشش کی تھوڑی دیر یونہی ہوتا رہا۔ بالاخر وہ صاحب جھنجلا کر امپائر سے مخاطب ہوئے۔

"یہ کیا مذاق ہے وہ آتا ہے' ہاتھ گھما کر چلا جاتا ہے گیند کیوں نہیں کراتا؟"

نیا گل' حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

مریض : "ڈاکٹر صاحب آپ کی دوا سے میرا بخار تو ٹوٹ گیا لیکن کمر کا درد ابھی باقی ہے۔"

ڈاکٹر : (بے خیالی میں) "کوئی بات نہیں وہی دوا پیتے رہو۔ دو ایک روز میں کمر بھی ٹوٹ جائے گی۔"

مرسلہ : محمد شاہد جمعہ خان سانھبری' حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

عدالت میں جرح کے دوران وکیل صاحب نے غصے سے پلٹ کر چھڑی ملزم کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا : "اس چھڑی کے سرے پر ایک انسان نہیں شیطان کھڑا ہے۔" ملزم نے نہایت سادگی سے سوال کیا : "جناب کون سے سرے پر؟"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بچہ کسی گھر کے سامنے کھیل رہا تھا۔ ایک سپاہی نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے ابو گھر پر ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

سپاہی بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ لیکن کوئی برآمد نہیں ہوا۔ وہ غصے سے بولا "تم نے کہا تھا کہ میرے ابو گھر پر ہیں۔"

بچہ : "معصومیت سے لیکن یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔"

عبدالقدیر فراز عیسی پنجگوری۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک لیڈر پاگل خانے میں اخلاقیات پر تقریر کر رہا تھا۔ تقریر بہت طویل ہوگئی تو ایک پاگل نے اٹھ کر کہا : "یہ بکواس بند کیجئے۔ بس بہت ہو چکا۔"

لیڈر نے حیرت اور غصے سے پاگل خانے کے انچارج کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں نیچی کر کے کہا : "سر آپ اپنی تقریر جاری رکھیں۔ اس کی پروا نہ کریں۔ یہ سال میں ایک آدھ بار ہی عقل کی بات کرتا ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بلیک ہول دوسرے بلیک ہول کو کچھ ایسے ہڑپ کرتا ہے

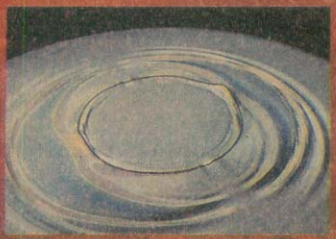

آیئے!

بلیک ہول

کی سیر کو چلیں

ناظر محمود

"بریف ہسٹری آف ٹائم" کے مصنف ہاکنگ

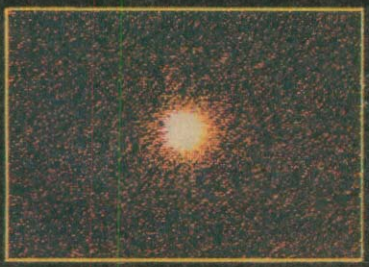

بلیک ہول آج کی سائنسی دنیا کا بہت بڑا معمہ ہے۔ اس موضوع پر تحقیق کا سفر جاری ہے اور ہر نئی تحقیق حیرت کے نئے در کھول رہی ہے۔ آیئے! ہم بھی اس موضوع کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

سفر کے لئے تیار ہوں اور سیٹ بیلٹ باندھ لیں ۔ دور سے
بلیک ہول گرما گرم گیسوں کا پیالہ معلوم ہوتا ہے ۔

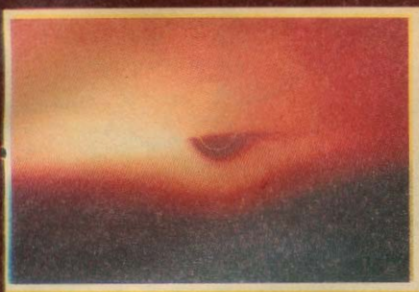

ہوشیار ! سامنے بلیک ہول ہے ۔ آپ بھاگ سکتے ہیں تو بھاگ
لیں ورنہ جلدی ہی آپ بلیک ہول میں گر جائیں گے ۔

ارے یہ کیا ہے سامنے بادل آگئے ۔ پیالے میں جھانکیں تو اندھیرا
نہیں لیکن ہمیں دیا دیا کر گھوم نکالا جا رہا ہے ۔

بلیک ہول سے باہر ہمارے آخر لمحات ۔ پیالے میں گھستے ہی ہمیں
کناروں پر روشنی نظر آتی ہے جو فوراً گہرائی میں گم ہو جاتی ہے ۔

واپسی کا کوئی راستہ نہیں
بلیک ہول کا گھٹاٹوپ اندھیرا ہے اور
ہم ہیں دوستو !

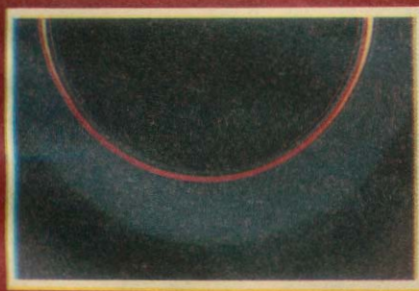

پاتال کی گہرائی میں ہم دوسروں کے لئے جم چکے ہیں ۔
لیکن ہمارے لئے صرف ایک لمحے میں کھیل ختم ۔
پیسہ ہضم ۔

بلیک ہول کی سیر

ناظر محمود

ناظر محمود صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ بہت پڑھے لکھے، بڑی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک، اشتہاریات کی دنیا سے انہیں خصوصی تعلق ہے، تدریس سے بھی وابستہ ہیں اور دنیائے علم و ادب سے بھی۔

مشہور سائنس دان اور مصنف (Hawking) کی کتاب (Brief History Of True) چند سال قبل شائع ہوئی تو اس کتاب نے دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ اس کتاب نے دنیا کے سائنسی اور علمی حلقوں میں نئے مباحثے چھیڑ دیئے۔

ناظر محمود صاحب نے وقت کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کتاب کا ترجمہ "وقت کا سفر" کے عنوان سے کر ڈالا۔ "بلیک ہول" بھی چونکہ "وقت کے سفر" کے بہت سے موضوعات میں سے ایک ہے اسی لئے ناظر صاحب نے یہاں اس موضوع پر ہمارے قارئین کو کچھ بتانے کی کوشش کی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ یہ اس موضوع پر جامع مضمون نہیں بلکہ محض تعارفی سطور ہیں۔ اگر ہمارے پڑھنے والوں نے اس موضوع میں دلچسپی لی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک مفصل اور معلوماتی مضمون کے ساتھ آپ کی راہنمائی نہ کریں۔

کچھ عرصے پہلے تک گھروں میں نانی اماں یا دادی اماں یہ مصرعے اکثر بچوں کو سنایا کرتی تھیں ؎

چندا ماموں دور کے
بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں
منے کو دیں پیالی میں

یہ اس زمانے کی بات ہے جب چاند واقعی بہت دور ہوا کرتا ہوگا۔ اب تو آپ کو معلوم ہے کہ آج سے تقریباً" تیس سال پہلے انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے اور اس کے بعد کے برسوں میں انسان نے چاند سے کروڑوں اور اربوں سال کے فاصلے پر واقع کہکشاں کے بارے میں

بھی بڑی حیرت انگیز معلومات اکٹھا کرلی ہیں۔

ان ہی معلومات کے ذریعے ہمیں کائنات میں موجود بعض ایسی عجیب و غریب چیزوں کا پتا چلا ہے جنہیں بلیک ہول کہا جاتا ہے۔

بلیک ہول کیا ہیں؟ ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا تو ممکن نہیں البتہ ان کی موجودگی کے بارے میں قیاس آرائیاں بڑے عرصے سے جاری ہیں۔

جہاں کائنات میں ہزاروں اور لاکھوں کہکشائیں اور ستاروں کے جھرمٹ موجود ہیں وہاں کائنات کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جہاں مکمل تاریکی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جب کوئی ستارہ اپنی طبعی عمر پوری کرلیتا ہے تو اس کا تمام ایندھن جل جاتا ہے۔ اور تمام ایندھن ختم ہوجانے کی صورت میں وہ ستارہ اپنے آپ پر ڈھیر ہوجاتا ہے۔ یعنی وہ سکڑنا شروع ہوجاتا ہے اور سکڑتے سکڑتے اس کا حجم بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ لیکن اس کی کشش میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ اپنے اطراف کی ہر چیز کو بڑی تیزی سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ہڑپ کرجاتا ہے۔

مثال کے طور پر اس وقت زمین کی کشش سے نکلنے لئے کوئی گیارہ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار درکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر زمین کا حجم کم کردیا جائے تو کشش بھی بڑھ جائے گی اور زمین کی کشش سے نکلنے کے لئے رفتار بھی بہت زیادہ درکار ہوگی۔

سائنس دانوں کے قیاس کے مطابق بلیک ہول ایسے تباہ شدہ ستارے ہیں جن کا حجم بہت ہی کم اور کشش بہت ہی زیادہ ہے۔ اتنی زیادہ کہ روشنی بھی ان کی کشش سے دور نہیں بھاگ سکتی اور نتیجہ یہ کہ وہاں ہمیں سوائے اندھیرے سوراخ کے کچھ نظر نہیں آتا۔

اکثر بلیک ہول مختلف کہکشاؤں کے مرکز میں واقع ہیں اور شاید ہم سے قریب ترین بلیک ہول ہماری کہکشاں "ملکی وے" کے مرکز میں ہے جس کے گرد پوری کہکشاں گھوم رہی ہے اور شاید رفتہ رفتہ اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

آپ شاید پانی کے بھنور یا ہوا کے بگولے کا تصور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر چیز اس کے مرکز کے اندر چلی جاتی ہے۔ ایک بالٹی یا بڑے برتن میں پانی لیں اور اسے تیزی سے گھمائیں اور پھر اس میں کوئی چیز ڈال دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ چیز جلد ہی گھومتے گھومتے مرکز کے اندر چلی جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح بلیک ہول بھی ایک بھنور کی طرح ہر چیز کو نگل لیتے ہیں حتیٰ کہ دوسرے بلیک ہول کو بھی۔

جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اسی طرح اگر کسی بڑے بلیک ہول کے نزدیک کوئی چھوٹا بلیک ہول آجائے تو چھوٹا بلیک ہول گھومتے گھومتے بڑے بلیک ہول میں گم ہوجائے گا اور بڑا بلیک ہول مزید بڑا ہوجائے گا۔ ہر نئی چیز ہڑپ کرنے کے ساتھ ہی بلیک ہول کی کشش میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کی بھوک بھی تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

جدید دور کے عظیم سائنس داں اسٹیون ہاکنگ نے بلیک ہول کی جستجو میں بڑا تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ممکن ہے کہ کائنات کی تمام کہکشائیں ایک ایک کرکے اپنے اپنے بلیک ہول میں گم ہوجائیں۔ اور پھر تمام چھوٹے بلیک ہول بڑے بلیک ہولوں میں غائب ہوجائیں اور پھر بڑے بلیک ہول ایک اور سب سے بڑے بلیک ہول کی نذر ہوجائیں۔

اگر ایسا ہوا تو کیا پوری کائنات ایک بلیک ہول بن جائے گی؟ اور پھر اس بلیک ہول کے اندر کیا ہوگا؟ کیا اس بلیک ہول کے دوسری طرف کوئی راستہ ہوگا جو کسی نئی کائنات کی طرف لے جائے گا؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم پہلے ہی کسی بلیک ہول کی نذر ہوچکے ہوں اور دوسری طرف سے باہر نکل چکے ہوں؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن انسان تلاش میں مصروف رہتا ہے اور اسے جواب ملتے بھی رہتے ہیں۔ مگر کب؟ کچھ نہیں معلوم۔

●●●●

"نیند کا عجیب گھنٹہ"

مرسلہ : عادل خان، ٹوپی صوبہ سرحد

بعض لوگوں کی نیند کچی ہوتی ہے اور ذرا سی آہٹ سے بھی جاگ جاتے ہیں، لیکن بعض لوگ اٹھانے سے بھی نہیں اٹھتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے اٹلی میں ایک ایسا گھنٹہ بنایا گیا ہے جو گہری نیند سونے والوں کو بھی جگا سکتا ہے۔ یہ گھنٹہ پہلے الارم بجاتا ہے، پھر کار کے ہارن کی سی آواز دیتا ہے، پھر کتوں کے بھونکنے کی آواز نکالتا ہے اور اگر پھر بھی کوئی نہ اٹھے تو آخر میں توپیں چلنے کی آواز دیتا ہے۔

قصّہ کوئز ۳

سلیم مغل

دلوں میں اتر جانے والے اور ذہن کو متاثر کرنے والے قصّے، جذبوں میں نئی روح پھونک دینے والے حقائق اور عزم کو نئی مہمیز عطا کرنے والے واقعات کی تاریخ سے چند واقعات آپ کے مطالعے کے لئے حاضر ہیں۔ ہر واقعے کے اختتام پر دو سوال سر اٹھاتے ہیں۔ گویا دس سوالوں کے جواب آپ کو دینا ہیں۔ بہت سے انعامات آپ کے منتظر ہیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا شرط ہے (مرتب)

(۱) یہ خطیب کون ہے جس نے ہزاروں کے مجمع پر جادو سا کر دیا ہے۔ ان گنت انسانوں کا سمندر یوں خاموش ہے جیسے ان کے تالو میں زبان یا ان کے جسموں میں جان نہ ہو۔ وہ بولے جا رہا ہے اور سننے والوں کی پلک تک نہیں جھپکتی۔ وہ الفاظ کو جب جب جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ جو کیفیت اور جو تاثر وہ پیدا کرنا چاہتا ہے کر لیتا ہے... وہ کہہ رہا ہے "میں نے ۴۰ برس تک لوگوں کو خدا کا کلام سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے، غاروں سے ہمکلام ہوتا جھوم اٹھتے، چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے، کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں، صرصر سے گویا ہوتا تو صبا ہو جاتی، دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں شگاف پڑ جاتے، جنگل لہرانے لگتے، صحرا سرسبز ہو جاتے۔ میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا جن کی زمینیں بنجر ہو چکی تھیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے، جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں، جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں، جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں، جن کا ٹھہرنا المناک اور جن سے گذر جانا کربناک ہے، جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے..."

(الف) برصغیر کی تاریخ کا معتبر نام، فن خطابت کے آسمان کا درخشاں ستارہ، انگریزوں کا دشمن اول اور عشق رسولؐ سے سرشار اس شخصیت کا نام کیا ہے؟

(ب) یہ شخصیت کہاں مدفون ہے؟

(۲) یہ بچہ نیو ہیم روڈ کے گھر کی بالائی منزل پر واقع دو کمروں کے ایک چھوٹے سے گھر میں سات دیگر افراد کے ساتھ رہا کرتا تھا رات کو جب سب سو جاتے تو یہ اکیلا دیر تک جاگتا اور لیمپ کی روشنی میں پڑھتا رہتا۔ ایک رات گھر کی ایک خاتون کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ نصف سے زیادہ رات گزر چکی ہے مگر یہ بچہ ابھی تک پڑھ رہا ہے۔ بزرگ خاتون بچے کے پاس گئیں اور کہا کہ "بچے اتنا نہ پڑھا کرو تو بیمار ہو جائے گا" بچے نے کہا۔ "بائی اگر میں اس وقت اتنی محنت نہ کروں گا تو زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام نہ کر سکوں گا"۔ یہ بچہ آگے چل کر بہت بڑا آدمی بنا۔

(الف) یہ کس بچے کا ذکر ہے؟ نام بتایئے

(ب) اس بچے نے کون سا کارنامہ سرانجام دیا؟

(۳) تحقیق اور تجربات کے دوران اس سائنس دان کے ذہن میں عجیب و غریب خیال آیا۔ اس کے خیال میں وہ تمام لوگ جو گائے پالتے ہیں یا گائے کا دودھ دوہتے ہیں وہ چیچک سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس نے اس مفروضے پر اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا۔ اسے معلوم ہوا کہ خود گائے کو بھی چیچک سے کم تر ایک بیماری ہو جاتی ہے جسے "کاؤپاکس" کہتے ہیں۔ لہٰذا اس نے کاؤپاکس کے جراثیم سے ایک دوا (ویکسین) تیار کر لی مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس ویکسین کا تجربہ کس انسان پر کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے کوئی شخص رضا کار بننے پر آمادہ نہیں تھا۔ آخر کار ایک باہمت عورت اپنے بیٹے جیمز فلپس کو رضا کار بنانے پر آمادہ ہو گئیں۔

چیچک کے خلاف پہلا ویکسین جیمز فلپس کو دیا گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے چیچک جیسے مہلک مرض کے حملے سے محفوظ ہو گیا۔

(الف) سائنسی تاریخ کا یہ اہم واقعہ کس ملک میں پیش آیا؟

(ب) چیچک کی ویکسین تیار کرنے والے سائنس دان کا نام کیا تھا؟

(۴) جنگل سے گذرتے ہوئے اس نے ہرن کا ایک خوبصورت سا بچہ پکڑا۔ اسے اپنے ساتھ

گھوڑے پر رکھا اور چل دیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ کیا دیکھتا ہے کہ ہرن بچے کی ماں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے۔ وہ رک گیا۔ ہرنی بھی رک گئی۔ ہرنی اسے درخواست گذار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ خدارا میرا بچہ مجھے واپس کردو۔ آخر کار اس نے بچے کو رہا کردیا... بچہ چوکڑیاں بھرتا ہوا ماں کے پاس چلا گیا۔ ہرن کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ یہ نوجوان مطمئن اور مسرور واپس آگیا۔۔۔ اللہ کی مخلوق پر رحم کرنے والا اور بے زبان ماں اور بچے کا دل رکھنے والا یہ نوجوان بے خبر تھا کہ اللہ نے اس پر کامیابی کے کون سے در کھول دیئے ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہی نوجوان افغانستان کی ایک ریاست کا حکمران بنا۔ اس کا بیٹا آگے چل کر نامور فاتح اور اسلامی تاریخ کا درخشاں ستارہ بنا۔

(الف) بتایئے یہ قصہ کس شخصیت کا ہے؟

(ب) یہ شخصیت کس ریاست کی حکمران بنی؟

(۵) فرانس خانہ جنگی کی سی کیفیت سے گذر رہا تھا۔ ادھر انگریز سپاہی بھی فرانسیسی سپاہیوں پر حملے کررہے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے۔ یہ لڑکی پر عزم تھی کہ وہ کچھ کرے مگر کس طرح؟ آخر کار اس نے کہنا شروع کردیا کہ "مجھے غیب سے یہ اشارہ ملا ہے کہ میں فرانسیسی سپاہیوں کی مدد کروں۔" اس مقصد کے لئے اس نے بادشاہ سے ملنا چاہا مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ لوگ بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ ایک ان پڑھ دیہاتی اور نو عمر لڑکی کی اس بات پر یقین بھی کس طرح کیا جاتا کہ اسے غیب سے کوئی اشارہ ملا ہے۔ لوگوں نے اسے دیوانی، جادوگرنی، دھوکے باز اور نہ جانے کیا کیا کہنا شروع کردیا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور آخر کار بادشاہ کے بڑے بیٹے سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ شہزادہ اس کے جوش و جذبے اور عزم سے بے حد متاثر ہوا۔ آخر کار فوج کی کمان اسے دے دی گئی۔ اپریل ۱۴۲۸ء میں اس نے فوج کی مردانہ وردی پہنی۔ اپنے ایک ہاتھ میں سفید جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لی اور دس ہزار کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے اورلینز کے محصور شہر میں جا گھسی۔ اس نے شجاعت کے ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ و جاوید ہوگیا۔ شاعروں اور ادیبوں نے اسے اپنی تحریروں کا محور بنایا۔ ۳۰ مئی ۱۴۳۱ کو اسے انگریزوں نے ایک مقدمے میں کارروائی کے بعد جادوگرنی قرار دے دیا۔ یہیں اس کی

موت کا فیصلہ بھی ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے مقدمے پر نظر ثانی کی گئی اور اسے بے گناہ بھی قرار دیا گیا مگر اس وقت تک وہ امر ہو چکی تھی۔

(الف) ہم کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں۔ نام بتایئے؟

(ب) اس لڑکی کی موت کس طرح واقع ہوئی؟ وضاحت کیجئے۔

درست جوابات۔ قصہ کوئیز ۲۔ ماہ اکتوبر ۹۶ء

۱۔ (i) جنگ تبوک (ii) حضرت ابوبکر صدیقؓ

۲۔ (i) ہٹلر (ii) جرمنی

۳۔ (i) ابرہام لنکن (ii) سولھواں صدر

۴۔ (i) لیاقت علی خاں (راولپنڈی) (ii) سید اکبر۔

۵۔ (i) فلورنس نائٹ اینگل (ii) انگلستان

(چونکہ نائٹ اینگل کی پیدائش اٹلی کی ہے اس لئے "اٹلی" کو بھی درست مانا گیا) ۔

قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات کے لئے منتخب کئے جانے والے ۱۰ خوش نصیب ساتھیوں کے نام

۱۔ عظمیٰ کامل	لاہور
۲۔ روبینہ زبیر	اسلام آباد
۳۔ سید حسنین حیدر زیدی	بھکر
۴۔ رانا حسن طاہر	بورے والا
۵۔ ظفر اقبال	کراچی
۶۔ صائمہ محمد عمر گدی پٹھان	حیدر آباد سندھ
۷۔ امتیاز احمد گوہری	ٹوبہ ٹیک سنگھ
۸۔ مس نازیہ اعظم	گوجرانوالہ کینٹ
۹۔ اعجاز طالب اعجاز	ٹوبہ ٹیک سنگھ
۱۰۔ نازیہ سید نازی	بھکر

چاند نگر

محسن علی

چاند کی کرنیں کومل کومل
جیسے بچے شوخ اور چنچل
جیسے باغ میں پھول اور کونپل
چل مرے راکٹ چاند نگر چل

چل کے وہاں اک شہر بسائیں
سڑکیں اور فٹ پاتھ بنائیں
باغ لگائیں، پھول کھلائیں
چل مرے راکٹ چاند نگر چل

چاند کا آؤ کریں نظارا
کتنا دل کش یہ سیارا
روشن روشن پیارا پیارا
چل مرے راکٹ چاند نگر چل

آج انساں مجبور نہیں ہے
راز یہ اب مستور نہیں ہے
چاند نگر کچھ دُور نہیں ہے
چل مرے راکٹ چاند نگر چل

نامے میرے نام

گلشن اقبال، کراچی سے ریحان شکیل لکھتے ہیں کہ "تایا کی سنائی ہوئی کہانی پہلی مرتبہ بھیج رہا ہوں۔ شائع نہ کی تو دل، گردے، کلیجی سبھی کچھ ٹوٹ جائیں گے۔"

ریحان شکیل صاحب آپ نے کہیں یہ خط قصائی کی دوکان پر تو بیٹھ کر نہیں لکھا۔ ہم نے آج تک دل ٹوٹنے کا تو سنا تھا۔ یہ کلیجی اور گردے کب سے ٹوٹنے لگے۔ اور ہاں تایا کی کہانی ہم نے پڑھ لی...... اس پر مباحثہ جاری ہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ اس کہانی کی اشاعت سے ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اور بھی بہت سے پڑھنے والے اپنے تایاؤں کے ساتھ یہی سلوک نہ شروع کردیں۔ یوں گویا ہر قلمکار ایک تایا کا محتاج ہو کر رہ جائے...... ہمارے فیصلے کا انتظار کیجئے۔

حیدر آباد کی سمیرا فریہ کہتی ہیں "اکتوبر کا ٹائیٹل بہت خراب تھا۔" پشاور کی عنبرین نصر قریشی نے لکھا ہے "ٹائیٹل دیکھ کر میرا دل خوشی سے کھل اٹھا۔" حب چوکی کے اطہر زبیری صاحب کہتے ہیں "ٹائیٹل پھیکا تھا جبکہ کرن یار محمد نے حیدر آباد سے لکھا ہے کہ "سرورق نے تو دل جیت لیا۔"

○ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کس کی بات مانیں اور کس کی رد کریں۔ اس تضاد بیانی سے ثابت یہ ہوا کہ ہم سب لوگ پسند اور ناپسند کے معاملے میں کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔ اپنے مزاج اور کیفیات میں فرق ہونے کی وجہ سے ہماری پسند اور ناپسند عموماً" ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتی ہیں۔ البتہ آنکھ مچولی کی تحریروں اور

سلسلوں کو سب نے سراہا ہے سب کا بے حد شکریہ۔

لاہور کے امان اللہ نیر شوکت اپنے خط میں برہم نظر آتے ہیں۔ اتنے برہم کہ انہوں نے ہمیں جو کچھ نہیں لکھا ہم اس کا اندازہ بھی کرسکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "آپ لوگ ہم لاہور والوں کی تحریریں نہیں چھاپتے۔ لاہور والوں کے خطوں کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ مسلمان ہونے کے ناطے میری نظموں کے سلسلے میں جواب دینا آپ کا فرض بنتا ہے۔

○ "امان اللہ صاحب! ناک سے مکھی اڑایئے اور ہماری بات سنیئے۔ یہ آپ نے لاہور اور کراچی کا جھگڑا کیوں شروع کردیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتیجے نکالنے سے گریز کرنا چاہئے۔ لاہور ہو یا کراچی، پشاور ہو یا کوئٹہ، اپنے ملک کے تمام شہر اور ان شہروں کے سب رہنے والے ہمیں دل سے عزیز ہیں۔ آپ کبھی آنکھ مچولی کے صفحات پر غور کیجئے۔ لاہور کا نام کتنے صفحات پر جگمگاتا ملے گا۔ آپ کی نظموں کے سلسلے میں بہ حیثیت مسلمان جواب دینے والی بات بھی خوب رہی۔ کاش! آپ نے نظموں کے ساتھ لفافہ بھیج دیا ہوتا تو آپ کو جواب کب کا مل چکا ہوتا۔ ہماری جانب سے علیحدہ خط کا انتظار کیجئے۔

پنجگور سے، سعید اکبر نے بھی یہی شکوہ کیا ہے، آپ ہمیشہ پنجگورین کی تحریریں شائع نہیں کرتے۔

○ بھائی سعید! یاد رکھیں تحریریں "کوٹے" پر شائع نہیں ہوتیں، معیار پر شائع ہوتی ہیں۔ مطلوبہ معیار، کراچی سے مل جائے یا چارسدہ سے۔ معیاری تحریروں کو ہمیشہ آنکھوں سے لگائیں گے اور آنکھ مچولی میں جگہ دیں گے۔

دہلی کالونی، کراچی سے ملیحہ عبدالمتین نے "نامے میرے نام" کے اس نئے انداز کو بے حد پسند کیا ہے۔ انہیں اس بات پر شدید کوفت ہوئی ہے کہ ہم نے اب تک انہیں نہیں بتایا کہ ان کی تحریریں کب شائع ہوں گی۔ اور ہوں گی بھی یا نہیں؟ ملیحہ نے بہت اچھی تجویز دی ہے کہ ناقابل اشاعت کی طرح قابل اشاعت تحریروں کے نام بھی شائع ہونے چاہئیں۔

○ ملیحہ آپ کی تجویز اچھی لگی آئندہ ماہ سے اس پر عمل ہوگا۔ آپ کو جو کوفت ہوئی اس پر معذرت..... اور نئے سلسلے کو پسند کرنے کا شکریہ۔

ارم ابراہیم نے نہ جانے کس شہر سے خط لکھا ہے اور تڑی لگائی ہے کہ "میرے خط کا جواب نہ دیا تو خفا ہوجاؤں گی۔"

○ حالانکہ اس خط میں انہوں نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کا جواب دیا جاسکے۔ ارم! خفا نہ ہوں دیکھیں آپ کا خط اور آپ کا نام شائع ہوگیا۔

بورے والا سے حسن طاہر نے لکھا ہے کہ "پہلی مرتبہ لب کشائی کی جسارت کر رہا ہوں۔"

○ طاہر صاحب! آپ نے جب پہلی مرتبہ لب کھولے ہوں گے تو نہ جانے کیا کیا کہا ہوگا۔ ہمارے ہاں تو بچے ایک سال کی عمر میں لب کشائی اور ۵ سال کی عمر میں روزہ کشائی کر چکتے ہیں۔ آپ نے لب کشائی اس عمر میں کی، چلیں ٹھیک ہے دیر سے سہی مگر ہوئی تو۔

گجرات سے محمد رحمت اللہ بشیر قادری عطاری صاحب کے دو بڑے ہی نستعلیق خطوط ملے ہیں۔ ان خطوں میں انہوں نے ہمیں ۲۵ مرتبہ عالیجاہ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ غالباً یہ خط ان دنوں میں لکھا گیا جب ٹی وی پر مشہور اداکار طلعت حسین عالی جاہ کا کردار ادا کر رہے تھے۔

○ بشیر قادری صاحب! آنکھ مچولی کو دیکھ کر رال ٹپکانا سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں تو حلوہ پکانے کی کوئی ترکیب بھی درج نہ تھی۔ آپ کو امتحان میں چوتھی پوزیشن حاصل کرنے پر ہمارے پورے ادارے کی طرف سے مبارک باد۔ آپ نے بزرگوں کی طرح سے جو بہت سی دعائیں ہمارے لئے لکھی ہیں اس پر دلی شکریہ۔

تانبدہ ملک، آپ کے خط پر آپ کے شہر کا نام تو درج نہیں پھر بھی آپ کے سوال کا جواب دیئے دیتے ہیں۔ "مقابلہ نمبر" جنوری ۹۷ء میں شائع ہوگا۔ انشاء اللہ اس میں شائع ہونے والی تحریریں "مقابلے" کے گرد گھومتی ہوئی ہوں گی۔ اور یہ کہ اس میں بہت سے دلچسپ مقابلے بھی شائع ہوں گے۔ مثلاً" تحریری مقابلے، معلوماتی مقابلے، تصویری مقابلے وغیرہ وغیرہ آپ بھی کچھ نہ کچھ لکھ بھیجیں۔ آنکھ مچولی کو پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کی کہانی جلد شائع ہو جائے گی۔

لاہور سے طارق ریاض خان نے آنکھ مچولی کی ایک ایک تحریر کا جائزہ لینے کے بعد آخر میں لکھا ہے "ویلڈن آنکھ مچولی" جواباً" تھینک یوں طارق ریاض خان"

ریاض احمد نے ہائی اسکول پبنی سے شکوہ کیا ہے کہ "آنکھ مچولی میں قسط وار ناول کیوں نہیں؟"

○ ریاض صاحب اس بار ناول کا اعلان پڑھ کر آپ کا شکوہ دور ہو گیا ہوگا۔ ہوا یا نہیں؟؟

ہما گل، حیدر آباد سے لکھتی ہیں "میں نے شرارتی بچوں کے لئے شرارتی سی کہانی لکھی ہے تاکہ نئی نئی شرارتیں کر کے بچوں کو شرارتی بنائیں۔ کیا خیال ہے شرارتی انکل؟

○ جی میری شرارتی بھتیجی آپ نے بہت اچھا کیا۔ بچے پہلے کیا کم شرارتی ہیں کہ انہیں مزید شرارتی بنانے کے لئے کہانیاں لکھیں جائیں۔ آپ کی شرارت ہمیں پسند نہیں آئی۔ ویسے ناپسند بھی نہیں آئی۔ تحریر شائع ہوگی مگر انتظار کرنا پڑے گا۔

مفت کی سواری

کمال احمد حادم

لوگ بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں کیوں سفر کرتے ہیں؟ یہ بات معظم کو معلوم نہیں تھی۔ وہ بارہ برس کا ایک خوبصورت اور ذہین لڑکا تھا۔ اسے صرف یہی معلوم تھا کہ بغیر ٹکٹ سفر کرنا ایک بہت ہی مشکل فن ہے۔ جو کافی کوشش کے بعد سیکھا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے ابا کے ساتھ میرپور خاص سے کئی مرتبہ کراچی آیا تھا۔ اس کے ابا جان نے بہت کم مرتبہ اپنا اور اس کا ٹکٹ خریدا تھا۔ عموماً" وہ ایسے ڈبے میں سوار ہوتے تھے جس کے اندر ٹی ٹی موجود نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی ٹکٹ چیکر اس ڈبے میں آنے والا ہوتا تو وہ اس ڈبے کو چھوڑ کر دوسرے ڈبے میں چلے

جاتے تھے۔ کبھی پکڑے ہی لئے گئے تو اس کے ابا نے چیکر کو پانچ دس روپے دے کر جان چھڑالی تھی۔

ایک دن جب معظم اپنے ابا کے ساتھ کراچی جارہا تھا تو اچانک ریلوے مجسٹریٹ کے حکم سے اس کے بہت سے ٹکٹ چیکر اور پولیس والوں نے گاڑی کو بیچ راستے میں روک لیا۔ جو مسافر بغیر ٹکٹ سفر کررہے تھے گھبرا گئے۔ اب وہ ادھر ادھر کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتے تھے کیوں کہ چاروں طرف پولیس گھیرے ہوئے تھی اور نہ کسی جگہ چھپ سکتے تھے کیونکہ انہیں ہر طرف سے بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ معظم بھی اپنے ابا جان کے ساتھ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں گرفتار ہوگیا۔ ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگادی گئیں۔ یہ دیکھ کر معظم رونے لگا۔ اس کے ابا نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ اپنے ابا کے غصے سے بہت ڈرتا تھا۔ اس لئے اس وقت بھی اپنے ابا کے ڈانٹنے پر خاموش تو ہوگیا۔ لیکن اسے اس وقت اپنے ابا بہت ظالم اور بے رحم معلوم ہوئے کیوں کہ اسے یقین تھا اب پولیس والے اسے ماریں گے بھی۔ اس نے آج تک اپنے ابا سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ ٹکٹ کیوں نہیں خریدتے؟ لیکن اس بات پر وہ اب غور کررہا تھا کہ "میرے ابا ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

اس کے ابا کی ایک کپڑے کی دکان تھی۔ ہفتے دو ہفتے بعد وہ کپڑا اور گھر کی دوسری ضروریات کی اشیاء خریدنے کے لئے کراچی آتے تھے۔ کبھی اکیلے اور کبھی معظم کو ساتھ لے کر۔ اس کے ابا اکثر کہتے "چل معظم! تجھے کراچی گھما لاؤں۔ ٹکٹ تو لگتا نہیں اپنی گاڑی ہے کون پوچھتا ہے۔"

چوں کہ معظم کو گھومنا اچھا لگتا تھا اس لئے وہ ساتھ چل پڑتا۔ مگر اب تو وہ پکڑ لئے گئے تھے۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کو ایک الگ ڈبے میں بٹھا لیا گیا۔ وہ تعداد میں بہت تھے، بہت زیادہ۔ ان لوگوں میں مزدور، کسان، طالب علم اور ملازم سب شامل تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

کراچی پہنچ کر انہیں ریلوے مجسٹریٹ کی عدالت میں لے جایا گیا۔ انہیں ہتھکڑیوں میں دیکھ کر کئی لوگ ہنس رہے تھے۔ جیسے ان کا مذاق اڑا رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں "دیکھ لیا بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا انجام!" واقعی بہت بے عزتی ہورہی تھی۔ معظم کا دل چاہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ لیکن ابا کے ڈر سے ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے سنا ایک آدمی کہہ رہا تھا

"بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے گورنمنٹ کو ہر سال کروڑوں روپے کا نقصان پہنچاتے ہیں۔"

یہ سن کر معظم حیران رہ گیا۔ چھوٹا سا بچہ تھا اسے کیا معلوم کہ گورنمنٹ کو کروڑوں روپے کا نقصان کیسے ہو جاتا ہے؟ اس نے پھر اپنے ابا جان کی طرف دیکھا لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد مجسٹریٹ کی عدالت کھل گئی۔ تمام مجرم اندر لے جائے گئے۔ سب کے نام لکھے گئے اور انہیں باری باری مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ معظم ان تمام لوگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جو مجسٹریٹ کے سامنے بیان دے رہے تھے۔ ایک شخص نے اپنی کٹی ہوئی جیب دکھاتے ہوئے کہا۔"کسی نے میری جیب کاٹ لی تھی میرا بٹوہ اور ٹکٹ چوری ہو گیا۔" لیکن جب اس شخص کی تلاشی لی گئی تو ایک دوسری جیب میں سے اس کا بٹوہ مل گیا۔ جس میں دو سو بیس روپے تھے۔ مجسٹریٹ نے اس پر دو سو روپے جرمانہ کر دیا۔

ایک دیہاتی نے اور تو کچھ نہ کہا ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی کہ وہ پھر ایسا نہیں کرے گا۔ مجسٹریٹ نے اس پر بھی ۲۰۰ روپے جرمانہ کر دیا۔ پھر ایک ایسے آدمی کی باری آئی جو تیسری بار اسی جرم میں پکڑا گیا تھا۔ مجسٹریٹ نے اسے پہچان لیا اور اسے چھ مہینے کی کڑی سزا دے دی۔

یہ دیکھ کر معظم حیران ہوتا رہا کہ لوگ سزا بھگت کر بھی یہ جرم کرنے سے باز نہیں آتے۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو نہ جانے کس سوچ میں تھا۔ معظم نے آہستہ سے اپنے ابا سے پوچھا "ابا تمہارے پاس جرمانہ دینے کے لئے روپے ہیں؟" "چپ ہو جاؤ!" اس نے معظم کو جھڑک دیا۔ باپ کی ڈانٹ سن کر معظم کو بہت غصہ آیا۔ اس نے پھر اپنے ابا کی طرف نہ دیکھا۔ اور مجسٹریٹ کی طرف دیکھنے لگا جو ایک آدمی سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہارا نام؟"

"محمد علی۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"گلوکار ہوں گاتا ہوں۔"

"بغیر ٹکٹ سفر کیوں کیا؟"

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"جب پیسے نہیں ہیں تو سفر کیوں کرتے ہو؟"

یہ سن کر اس آدمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے بولا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں کراچی پیسے کمانے کی خاطر ہی آیا ہوں کیوں کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ کسی میوزک اسکول میں ملازمت مل جائے گی۔"

"تمہارے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں؟"

"جی سچ کہتا ہوں بالکل نہیں ہیں آپ میری تلاشی لے لیجئے۔"

"اگر تم پر جرمانہ کردیا جائے تو کیسے ادا کرو گے؟"

"میں ادا نہیں کرسکوں گا جناب۔"

"پھر تمہیں سزا بھگتنی پڑے گی۔"

"بھگت لوں گا اور کوئی چارہ نہیں۔"

مجسٹریٹ نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا "کیا تم سچ مچ گاسکتے ہو؟ اچھا تمہاری سزا یہ ہے کہ تم سب کو ایک گانا سناؤ اور آئندہ کے لئے بغیر ٹکٹ سفر نہ کرنے کا وعدہ کرو۔"

یہ سن کر وہ آدمی اور عدالت میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ حیران رہ گئے۔ اس آدمی نے گانا سنا دیا۔ اسے چھوڑ دیا گیا۔ معظم سے چپ نہ رہا گیا۔ باپ سے کہنے لگا "ابا، ابا تم بھی تو صبح شام گھر میں کچھ نہ کچھ گاتے ہی رہتے ہو وہی سنا دو نا!"

معظم کی بات اور کئی آدمیوں نے بھی سنی اور بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ مجسٹریٹ نے سر اٹھایا۔ "کیا بات ہے؟ کون بول رہا تھا؟" اس نے پوچھا یہ سن کر معظم اٹھ کھڑا ہوا "میں ..... میں اپنے ابا سے کہہ رہا تھا کہ وہ بھی گانا سنا دیں تو چھوٹ جائیں گے۔" یہ سن کر مجسٹریٹ خود بھی ہنس پڑا۔ معظم سے پوچھا "تم کون ہو؟"

"معظم۔" اس نے کہا۔

"کس کے ساتھ ہو؟"

"ابا کے ------ وہاں بیٹھے ہیں۔" معظم نے انگلی سے بتادیا۔

مجسٹریٹ نے اس کے باپ کی طرف دیکھا۔ جس کے ہاتھ ہتھکڑی سے بندھے تھے۔ وہ اپنے لڑکے کی حرکتوں پر ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے معظم سے پوچھا "تم بغیر ٹکٹ سفر کیوں کررہے تھے؟" معظم نے کچھ دیر سوچا پھر جواب دیا۔ "میں خود تو گاڑی میں نہیں بیٹھا تھا۔ ابا لائے تھے۔"

"تو پھر تمہارے ابا کو کیا سزا دیں؟" یہ سن کر معظم کا ننھا سا دل کانپ اٹھا۔ اب وہ کیا کہے؟ کچھ دیر سوچتا رہا۔ مجسٹریٹ اسے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر مسکراتا رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکا بہت ذہین ہے۔ چند لمحوں میں معظم نے کچھ سوچ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس میں جرأت پیدا ہوگئی۔ وہ اچانک تن کر کھڑا ہوگیا اور بولا "اس میں میرے ابا جان کا کوئی قصور نہیں قصور تمہارا ہے!"

"تمہارا .....؟" مجسٹریٹ نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ عدالت میں

مجسٹریٹ کو تم یا تمہارا نہیں کہا جاسکتا بلکہ آپ اور آپ کا کہا جاتا ہے!"

"مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ پھر ایسا نہیں کہوں گا۔"

"شاباش ۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ اگر تمہارا باپ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"آپ کا قصور یہ ہے کہ آپ ہر روز گاڑی پر چھاپہ کیوں نہیں مارتے؟ آپ کے ڈر سے میرے ابا ہمیشہ ٹکٹ خریدیں گے۔"

"میں ہر روز ایک ہی گاڑی پر کیسے چھاپہ مار سکتا ہوں۔ مجھے کئی دوسری گاڑیوں کو بھی تو دیکھنا پڑتا ہے؟"

"پھر آپ اپنے عملے سے کہئے کہ وہ کیوں نہیں ہر گاڑی کو اچھی طرح چیک کرتے اور جب میرے ابا کو پکڑ لیتے ہیں تو ان سے پانچ دس روپے لے کر کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟"

عدالت میں اس وقت جتنے بھی ٹکٹ چیکر موجود تھے سب کے چہرے لٹک گئے۔ اور سر شرم سے جھک گئے۔ مجسٹریٹ نے جلدی جلدی کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر معظم سے کہا۔

"مجھے یقین ہے تم جھوٹ نہیں بولتے۔ میں تمہیں اور تمہارے ابا کو رہا کرتا ہوں۔ پھر کبھی بغیر ٹکٹ سفر نہ کرنا۔ اگر کبھی ریلوے کا کوئی ملازم کسی سے ناجائز روپیہ لے تو مجھے خبر کرنا میں اسے سخت سزا دوں گا۔" ●●●●

"آخری خواہش"

مرسلہ : عادل خان، ٹوپی صوبہ سرحد

سقراط کو سزا دینے سے پہلے پوچھا گیا۔ "تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں شہر کے سب سے اونچے مکان پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہوں کہ "اے لوگو! حرص اور طمع کی وجہ سے اپنی زندگی کے بہترین اور پسندیدہ ترین دن مال و دولت جمع کرنے میں کیوں بسر کر رہے ہو؟ یہ قیمتی وقت اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کیوں نہیں لگاتے جبکہ تم یہ ساری دولت چھوڑ کر خالی ہاتھ چلے جاؤ گے۔"

ننھی عمر یا بڑے کام

کام نہ کرنے والے بڑی عمر میں بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں۔ لیکن کام کرنے والے چھوٹی عمر میں بھی خوب کام کرتے ہیں، بڑے بڑے کام۔ مثال کے لیے دور کیا جانا، مثال سامنے ہے۔

ایری ڈیوس کی عمر ۱۲ سال ہے۔ شنگ گو سے تعلق رکھنے والے ایری کا شوق جو اب ان کا بزنس بن چکا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کپڑوں پر مختلف اقسام کی ڈیزائننگ کرتے ہیں۔ ایری کا اپنے بزنس کے متعلق کہنا ہے کہ وہ کچھ گھنٹے میں ایک شرٹ پر پینٹ کر لیتے ہیں اور یہ شرٹ تقریباً ۴۰ ڈالر میں فروخت کرتے ہیں اس کے علاوہ وہ لوگوں کے آرڈر پر ان کے جوگرز، سنوڑے، ہیٹ، پتلون، شرٹ وغیرہ پر بھی پینٹ کرتے ہیں۔

کلاؤن کے روپ میں یہ ۱۱ سالہ کیکی ہیں یہ مختلف شوز میں کلاؤن بن کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں اس کے علاوہ یہ ایک بہترین اداکارہ بھی ہیں اور تو اور یہ جادو کے کرتب بھی دکھاتی ہیں۔ تصویر میں آپ جو ان کا حلیہ دیکھ رہے ہیں یہ انہوں نے ایک ٹی وی کمرشل میں کام کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ کیکی کے بقول وہ ایک بریک شو کرنے کے ۱۲۵ ڈالر لیتی ہیں۔

خالد خلیل

شارجہ کے ہیرو...

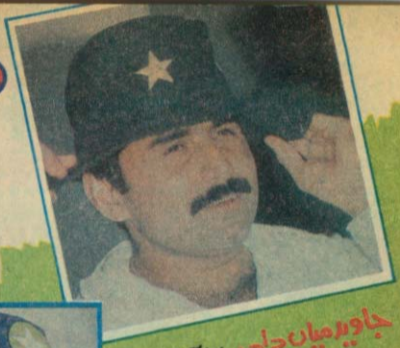

جاوید میاں داد: پہلے آسٹریشیا کپ 1986ء کے ہیرو... اور سب سے قیمتی تاریخ ساز چھکا مارنے والے...

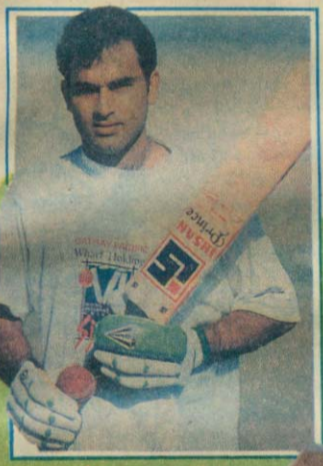

عامر سہیل
نیوزی لینڈ کے خلاف 134 رنز... 1993-94

انضمام الحق: سب سے بڑی انفرادی اننگز 137 رنز..

وسیم اکرم
شارجہ کے گراؤنڈ پر دو دفعہ ہیٹرک...

عاقب جاوید
شارجہ کے گراؤنڈ میں ورلڈ ریکارڈ.. 37 رنز کے عوض سات وکٹیں بھارت کے خلاف..

سلیم ملک
سب سے زیادہ 1373 رنز...

سعید انور
شارجہ کرکٹ گراؤنڈ پر ۴ سنچریاں..

عمران خان: 14 رنز کے عوض چھ کھلاڑی آؤٹ... بھارت کے خلاف

شارجہ میں کرکٹ کا ۲۰واں میلہ

سید یحییٰ حسینی

ون ڈے کرکٹ نے اس کھیل کو دنیا بھر میں بے حد مقبول بنا دیا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ آج کھیل کی یہ طرز کرکٹ کی پہچان بن گئی ہے۔ ون ڈے کرکٹ کے ٹورنامنٹس نے تو اس کھیل کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ صحراؤں کی سرزمین شارجہ اب اس حوالے سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ نومبر کی ۹ تاریخ سے شارجہ کپ کے لئے شارجہ میں پاکستان، سری لنکا اور نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیمیں ایک دوسرے کے مقابل ہوں گی۔ آیئے ایک نظر شارجہ کے پچھلے انیس کرکٹ ٹورنامنٹس اور ان میں بننے والے ریکارڈز پر ڈالتے ہیں۔

شارجہ کے کرکٹ ٹورنامنٹس کا جائزہ

سیزن	ٹورنامنٹ	فاتح	رنرز اپ	فائنل کا مرد میدان	دیگر شریک ٹیمیں
1983-84ء	روتھمنیز ایشیا کپ	بھارت	سری لنکا	سنیل گواسکر	پاکستان
1984-85ء	روتھمنیز ٹرافی	بھارت	آسٹریلیا	مہندر امرناتھ	پاکستان، انگلینڈ
1985-86ء	روتھمنیز چیلنج کپ	ویسٹ انڈیز	پاکستان	ویوین رچرڈز	بھارت
1985-86ء	آسٹریلیشیا کپ	پاکستان	بھارت	جاوید میانداد	آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، سری
1986-87ء	چیمپئنز ٹرافی	ویسٹ انڈیز	پاکستان	ویوین رچرڈز	بھارت، سری لنکا
1986-87ء	شارجہ کپ	انگلینڈ	پاکستان	جان ایمبری	بھارت، آسٹریلیا
1987-88ء	شارجہ کپ	بھارت	نیوزی لینڈ	روی شاستری	سری لنکا
1988-89ء	چیمپئنز ٹرافی	ویسٹ انڈیز	پاکستان	کرٹلی امبروز	بھارت

1988-89ء	شارجہ کپ	پاکستان	سری لنکا	عمران خان —
1989-90ء	چیمپئنز ٹرافی	پاکستان	ویسٹ انڈیز	عمران خان بھارت
1989-90ء	آسٹریلیشیا کپ	پاکستان	آسٹریلیا	وسیم اکرم نیوزی لینڈ، سری لنکا، بھارت، بنگلہ دیش
1990-91ء	شارجہ کپ	پاکستان	سری لنکا	اعجاز احمد —
1991-92ء	ولز ٹرافی	پاکستان	بھارت	عاقب جاوید ویسٹ انڈیز
1992-93ء	ولز ٹرافی	پاکستان	سری لنکا	سعید انور زمبابوے
1993-94ء	چیمپئنز ٹرافی	ویسٹ انڈیز	پاکستان	برائن لارا سری لنکا
1994-95ء	آسٹریلیشیا کپ	پاکستان	بھارت	عامر سہیل نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، متحدہ عرب امارات، سری لنکا
1994-95ء	ایشیا کپ	بھارت	سری لنکا	اظہرالدین پاکستان، بنگلہ دیش
1995-96ء	چیمپئنز ٹرافی	سری لنکا	ویسٹ انڈیز	اروندڈی سلوا پاکستان
1996ء	شارجہ کپ	جنوبی افریقہ	بھارت	گیری کرسٹن پاکستان

شارجہ کا پہلا ایک روزہ میچ

شارجہ کرکٹ اسٹیڈیم میں پہلا ایک روزہ میچ 6 اپریل 1984ء کو پاکستان اور سری لنکا کی کرکٹ ٹیموں کے مابین کھیلا گیا۔

سب سے زیادہ میچز

شارجہ کرکٹ اسٹیڈیم کو ون ڈے انٹرنیشنل کرکٹ گراؤنڈز پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہو چکی ہے کہ نہ صرف یہاں میچوں کی سنچری پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے بلکہ یہاں اب تک ریکارڈ ایک سو چودہ ون ڈے انٹرنیشنل منعقد ہو چکے ہیں۔

اننگز کا کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مجموعی اسکور

شارجہ میں کھیلے گئے میچز کی ایک اننگ کا سب سے زیادہ اسکور نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم کا

ہے جس نے 90-1989ء میں بنگلہ دیش کے خلاف پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے مقررہ پچاس اوورز میں چار وکٹوں پر 338 رنز بنائے تھے۔ اسی طرح یہاں کسی بھی ٹیم کا کم سے کم مجموعی اسکور 55 رنز ہے۔ 87-1986ء میں سری لنکا کی ٹیم 28.3 اوورز میں ویسٹ انڈیز کے خلاف اس اسکور پر آؤٹ ہوگئی تھی۔

سب سے زیادہ وکٹیں اور سب سے زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑی

سرزمین شارجہ کے حوالے سے یہ دونوں ہی ریکارڈز پاکستانی کھلاڑیوں کے پاس ہیں یہاں سب سے زیادہ وکٹیں لینے والے بالر وسیم اکرم ہیں جنھوں نے 391.1 اوورز میں 34 میڈنز اوورز کے ساتھ 1354 رنز کے بدلے 75 وکٹیں حاصل کیں جبکہ سب سے زیادہ رنز سلیم ملک نے بنائے ہیں انہیں 47 میچز میں 1367 رنز اسکور کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔

شارجہ میں سینچریاں

شارجہ میں اب تک 35 سینچریاں اسکور ہوچکی ہیں جن میں سب سے زیادہ یعنی 15 سینچریاں پاکستان کی جانب سے بنائی گئی ہیں جبکہ ویسٹ انڈیز کی 6، بھارت کی 7، سری لنکا اور جنوبی افریقہ کی تین، تین اور آسٹریلیا کی ایک سینچری اس فہرست میں شامل ہے۔ پاکستان کے سعید انور چار سینچریوں کے ساتھ سرفہرست ہیں جبکہ سلیم ملک اور رچی رچرڈسن تین تین، رمیز راجہ، برائن لارا، عامر سہیل، گیری کرسٹین، سچن ٹنڈولکر اور نوجوت سدھو دو دو سینچریوں کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

تین مسلسل سینچریاں

پاکستان کے سعید انور نے شارجہ میں 1993ء میں سری لنکا کے خلاف 30 اکتوبر کو 107، یکم نومبر کو ویسٹ انڈیز کے خلاف 131 اور پھر 2 نومبر کو سری لنکا کے خلاف 111 رنز بنا کر شارجہ کی کرکٹ ہسٹری میں تین مسلسل میچوں میں سینچریاں بنا کر ایک منفرد ریکارڈ قائم کیا۔

ون ڈے انٹرنیشنل میں دوسری وکٹ کی ریکارڈ پارٹنرشپ

1993-94ء میں شارجہ کے مقام پر کھیلتے ہوئے عامر سہیل (134) اور انضمام الحق (137) نے نیوزی لینڈ کے خلاف دوسری وکٹ پر 263 رنز بنا کر ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

ون ڈے انٹرنیشنل کی بہترین بالنگ

شارجہ میں ہی عاقب جاوید نے پاکستان کی طرف سے کھیلتے ہوئے بھارت کے خلاف 1991-92ء میں 37 رنز کے عوض 7 وکٹیں لے کر ون ڈے کرکٹ کی بہترین بالنگ پرفارمنس کا ریکارڈ قائم کیا۔

شارجہ میں ہیٹ ٹرک

بالر	تاریخ	تجزیہ	ہیٹ ٹرک کے شکار کھلاڑی
وسیم اکرم	14 اکتوبر 1989ء	5-38	جیفری ڈوجون، میلکم مارشل، کرٹلی، امبروز بولڈ
وسیم اکرم	4 مئی 1990ء	3-45	مرووہیوز، کارل ریکمین، ٹیری آلڈرمین بولڈ
عاقب جاوید	25 اکتوبر 1991ء	7-37	روی شاستری، اظہرالدین، ٹنڈولکر، ایل بی ڈبلیو

اننگ میں کسی بیٹسمین کا سب سے زیادہ اسکور

شارجہ میں ایک اننگ میں سب سے زیادہ رنز 169 کی شکل میں ویسٹ انڈیز کے برائن لارا نے 1995-96ء میں سری لنکا کے خلاف اسکور کئے۔

سب سے زیادہ چھکے اور چوکے

شارجہ کرکٹ گراؤنڈ پر کسی ایک اننگ میں سب سے زیادہ چھکے پاکستان کے باسط علی نے لگائے ہیں انہوں نے کل پانچ چھکے لگائے جبکہ چوکے مارنے والے ویسٹ انڈیز کے برائن لارا ہیں جنہوں نے کل 21 چوکے لگائے۔

ایک میچ میں دو ٹیموں کی جانب سے تین سو رنز کی اننگز

16 اکتوبر 1995ء کل اسکور 99.3 اوورز میں 662 - 17 ویسٹ انڈیز 333/7 بمقام شارجہ

سری لنکا - 329

بال کی کھال

محمد ریحان خان

☆ جوہر اور سالموں کی جسامت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ایک مٹھی بھر برف کی ڈلی میں پانی کا ہر سالمہ بڑھا کر مٹر کے دانے کے برابر کردیا جائے تو یہ مٹھی بھر برف دنیا کی تمام سطح کو ڈھانپ لینے کے لئے نہ صرف کافی ہوگی بلکہ دہلی کے قطب مینار اور امریکہ کی راک فیلر جیسی عمارتیں بھی اس کے نیچے دب کر رہ جائیں گی۔

☆ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ محمد بن قاسم نے سندھ پر قبضہ کے دوران ۷۱۲ء میں بحرۂ عرب میں ایک گلاس پانی انڈیل دیا تھا اور اب وہ پانی سمندروں میں خوب مل چکا ہے تو آج دنیا کے کسی بھی حصہ میں اور کسی بھی ذریعہ سے حاصل کئے ہوئے ایک گلاس پانی میں اندازاً ۲۵۰ سالمے ایسے ہوں گے جو محمد بن قاسم والے گلاس کے پانی میں موجود تھے۔

☆ ہمارے پھیپھڑوں میں ایک سانس کے ساتھ ہوا کے جس قدر سالمے داخل ہوتے ہیں ان میں سے کم از کم پانچ کروڑ ہوا کے سالمے ایسے ہوتے ہیں جو اورنگ زیب عالمگیر کی سانس کا حصہ بنے تھے اور اب سارے کرہ ہوا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

☆ برقی سالموں اور جواہر کے اس تناسبی جائزہ سے آپ نے ان مختصر ترین ذرات کی جسامت کا کچھ نہ کچھ اندازہ کرلیا ہوگا۔ ان ننھے منے ذرات میں قدرت نے طاقت اور توانائی کا کتنا بڑا سرچشمہ پوشیدہ کیا ہوا ہے کہ آج تمام اقوامِ عالم جوہری دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

وہ ایک ذرہ ناچیز جس کو خداوند قدوس نے بے پناہ طاقت، قوت اور توانائی سے نوازا اس کی حقیقتوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے ترجمان حقیقت حضرت علامہ اقبالؔ کا یہ شعر بھی ہمیشہ نظر میں رکھئے ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

بچت

شبیر بیگ ناز

بچت چاندنی رات کا روپ ہے
بچت سردیوں کی حسیں دھوپ ہے

بچت ہی کی تصویر ہے میرا گھر
بچت ہی سے خوش رنگ دیوار و در

بچت ہی سے ہے گھر کا حسن وجمال
بچت کے بنا، گھر کا چلنا محال

بچت ہی سے بچوں کے لب پہ ہنسی
بچت ہی سے کھلتی ہے دل کی کلی

بچت سے کھلونے بھی لاتے ہیں ہم
بچت ہی سے پکنک پہ جاتے ہیں ہم

بچت سے میرا بنک یوں بھر گیا
کہ جوں قطرے قطرے سے دریا بنا

بچت ہی سے عزت ہے گھر بار کی
بچت ہی سے عظمت ہے گھر بار کی

بچت ہی سے گھر ناز خوشحال ہے
یہ تنگ دستی کے سامنے ڈھال ہے

ماسٹر رمضان

یونس جاوید

چھوٹے نواب کی سال گرہ سر پر آگئی تھی۔ چھوٹے نواب کا نام تو چاند مرزا تھا، مگر سب ہی اسے چھوٹا نواب کہتے تھے۔ وہ نواب صاحب آفتاب احمد خان کا اکلوتا بیٹا تھا، اس لئے نواب صاحب اور ان کے سارے امیر وزیر چھوٹے نواب سے بہت پیار کرتے تھے۔

ایسے لاڈلے اور اکلوتے بچے کی سالگرہ کی تیاریاں کوئی معمولی بات نہ تھی۔ دو ماہ سے یہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ باقی سب کام تو مکمل ہو گئے مگر سب سے ضروری کام رہ گیا۔ چھوٹے نواب کی زری کی اچکن سلوانی کسی کو یاد نہیں رہی تھی، جس کا کپڑا صندوق میں پڑا تھا۔

جب سالگرہ میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اور نواب آفتاب احمد خان نے خود سارے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیا تو معلوم ہوا کہ سالگرہ پر پہننے کے لئے چھوٹے نواب کی اچکن

تیار نہیں کرائی گئی۔

دیوان جی کو شہر کی سب سے بڑی دکان زری ہاؤس کی طرف دوڑایا گیا کہ شاید چھوٹے نواب کے ناپ کی سلی سلائی کوئی خوب صورت اچکن مل جائے، مگر دیوان جی گھنٹہ بھر کے بعد منہ لٹکائے ہوئے واپس آگئے اور بولے :

"حضور! ان کے پاس سلی سلائی اچکن نہیں ہے۔ البتہ وہ ایک ہفتے تک سی کر دے سکتے ہیں۔"

یہ سن کر بڑے نواب صاحب غصے سے بولے :

"دیوان جی! آپ دیوانے ہوگئے ہیں کیا؟ ایک ہفتے کے بعد اچکن ہمارے کس کام کی؟ ہمیں تو آج رات بھر میں تیار ملنی چاہئے۔"

دیوان جی سہم کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔

سب نے طرح طرح کی ترکیبیں سوچنا شروع کردیں۔ حتیٰ کہ بات پہنچتے پہنچتے ماسٹر رمضان تک پہنچی۔

ماسٹر رمضان پچاس روپیہ ماہوار پر نواب صاحب کے پرانے کپڑوں کی مرمت کرنے پر ملازم تھا۔ وہ نواب صاحب کے پاس آکر چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہے؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"حضور! میں یہ مشکل آسان کرسکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"حضور!" ماسٹر رمضان آہستہ سے بولا۔ "میں رات بھر میں چھوٹے نواب کی اچکن تیار کرسکتا ہوں۔"

نواب صاحب نے ماسٹر رمضان کی بات پر جھلا کر کہا :

"دماغ تو ٹھکانے ہے تمہارا کہ نہیں؟ .....دس برس سے ہمارے بٹن ٹانک رہے ہو ..... کچھ ہوش کی دوا کرو۔"

دیوان جی نے، جو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھے، اپنا گلا صاف کیا اور بولے :

"حضور نواب صاحب! یہ ماسٹر رمضان خواہ مخواہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کررہا ہے۔"

اصل میں دیوان جی چاہتے تھے کہ ماسٹر رمضان اچکن نہ سی سکے، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ وقت کم ہونے کی وجہ سے نواب صاحب گھبرا کر تین گنا قیمت پر اچکن تیار کروالانے کے لئے کہیں گے اور یوں دیوان جی کو اچھی خاصی رقم مل سکتی تھی۔

"تو حضور! میرے لئے کیا حکم ہے؟" ماسٹر رمضان نے بہت ادب سے آہستہ سے پوچھا۔

"دیوان جی ٹھیک کہتے ہیں۔ تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔" نواب صاحب نے غصے سے جواب دیا۔ پھر انہوں نے دیوان جی سے مخاطب ہو کر کہا : "آپ صبح تک کسی بھی قیمت پر اچکن تیار کروالائیں۔"

دیوان جی یہ حکم سن کر خوشی خوشی کمرے سے جانے لگے تو ماسٹر رمضان نے جھک کر نواب صاحب کو بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا :

"حضور! آپ ایک بار اس خادم کو ضرور آزمائیں اور اگر اچکن آپ کو پسند نہ آئی تو میرے ہاتھ کٹوا دیں۔ مگر مجھے ایک موقع ضرور دیں۔"

نواب صاحب چکرا سے گئے اور بولے :

"اچھا.....!"

انہوں نے سوچنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد بولے :

"ٹھیک ہے۔ ہم اس شرط پر تمہیں اچکن کا کپڑا دیں گے کہ ناپسند ہوئی تو کپڑے کی قیمت لی جائے گی، نوکری سے جواب ملے گا اور جو بھی جرمانہ ہم چاہیں ..... تمہیں ادا کرنا پڑے گا ..... بولو! منظور ہے تمہیں یہ شرط؟"

"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے عالی جاہ!" ماسٹر رمضان نے جواب دیا۔

"سوچ لو...!" نواب صاحب نے کہا۔

"حضور! سوچ لیا ہے۔"

"دیوان جی!..... اچکن کا کپڑا ماسٹر رمضان کو دے دیا جائے۔" نواب صاحب نے حکم دیا۔

"حضور!..... عالی جاہ!..... جناب والا!..... بندہ کچھ عرض کر سکتا ہے؟"

"نہیں .....!" نواب صاحب نے کہا۔ "آپ مشورہ نہ دیجیے بلکہ کپڑا ماسٹر رمضان کو فوراً دے دیں۔"

ناچار دیوان جی نے کڑھتے ہوئے اچکن کا کپڑا ماسٹر رمضان کو دے دیا۔

رات بھر جاگ کر ماسٹر رمضان بڑی محنت اور لگن سے چھوٹے نواب کی اچکن سیتا رہا۔ وہ ایک پل کو بھی نہ سویا۔ اس نے صبح تک اچکن مکمل کرلی۔

صبح وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اچکن بہت اچھی تیار کی تھی۔ وہ خوش خوش نواب صاحب کے ہاں آیا اور اچکن نکال کر ان کے سامنے پھیلا دی۔

دیوان جی اور دوسرے لوگ جو وہاں موجود تھے، اچکن کو ہاتھ میں لے لے کر دیکھ رہے تھے۔ دیوان جی نے فوراً چھوٹے نواب کو بلوایا اور اچکن پہنانے لگے۔

جب پہنا چکے تو نواب صاحب نے پوچھا :

"پسند آئی، دیوان جی!"

دیوان جی نے ناک بھوں چڑھا کر کہا :

"اچکن تو بری نہیں، بس ذرا تنگ ہے اور سلائی یوں تو اچھی ہے، لیکن اناڑی ہاتھوں کا صاف پتا چل رہا ہے ..... یہ اچکن ہمارے چھوٹے نواب صاحب کے تو شایانِ شان نہیں ہے۔"

نواب صاحب نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا، لیکن وہ سب خاموش تھے۔ ماسٹر رمضان کچھ نہ بول سکا۔ لیکن سب کچھ سمجھ گیا کہ سب کئے کرائے پر دیوان جی کے لالچ نے پانی پھیر دیا ہے۔

دیوان جی پھر بولے :

"حضور، عالی جاہ! چھوٹے نواب صاحب کے قابل اچکن شہر کی سب سے بڑی دکان زری ہاؤس سے تیار کروالی جائے۔ میرے خیال میں قیمت زیادہ دے دیں تو دکان والے شام سے پہلے دے دیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ سالگرہ کل صبح ہے ورنہ اگر آج ہوتی تو ماسٹر رمضان کی اچکن نے سارا پروگرام کرکرا کردیا ہوتا۔"

نواب صاحب کو بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے دیوان جی کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے سر ہلا کر کہا :

"اس بے وقوف درزی نے خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع کیا اور ہمیں پریشان کیا ہے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ اچکن تیار نہ کرسکے گا۔"

پھر نواب صاحب نے غصہ میں ماسٹر رمضان کو سزا سناتے ہوئے کہا :

"یہ اچکن لے جاؤ ..... ہم تمہیں جرمانہ تو نہیں کرتے مگر اس اچکن کے کپڑے کی قیمت ضرور تم سے لیں گے ..... اور ہاں تم نوکری سے بھی برخاست ..... جاؤ، فوراً دور ہوجاؤ، ہماری نظروں سے۔"

ماسٹر رمضان پریشانی کی حالت میں باہر نکل آیا۔ وہ جانتا تھا کہ نواب صاحب نے محض دیوان جی کی باتوں میں آکر اچکن ناپسند کی ہے۔ ورنہ اچکن میں درحقیقت کوئی نقص نہیں تھا۔

پریشانی کی حالت میں ماسٹر رمضان جب اپنے گھر آیا تو اس کی بیٹی گھر کے کام کاج سے فارغ ہوچکی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو پریشان دیکھا تو وجہ پوچھی۔

ماسٹر رمضان نے بیٹی کو سارا قصہ سنا دیا۔ اس کی بیٹی کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ آخر کار اسے ایک تجویز سوجھی۔ وہ بولی :

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ شہر کی سب سے بڑی دکان زری ہاؤس پر آپ کا کوئی دوست ہے؟"

ماسٹر رمضان نے سوچتے ہوئے کہا :

"ہاں ہے! وہاں کا سب سے بڑا درزی میرے ساتھ اسکول میں پڑھتا رہا ہے۔"

"بس تو پھر کام بن گیا۔" ماسٹر رمضان کی بیٹی نے کہا۔

"آپ سیدھے اسی کے پاس جائیں اور ساری بات سنا کر یہ اچکن اسے دے دیں۔ جب دیوان جی اچکن سلوانے کے لئے وہاں آئیں تو وہ لوگ قیمت لے کر یہی اچکن شام کو انہیں دے دیں۔"

ماسٹر رمضان نے اپنی عقل مند بیٹی کے کہنے پر یہی کیا اور جب دیوان جی زری ہاؤس سے قیمت ادا کر کے اچکن لے آئے، تو وہ خود بھی دوسرے دن سال گرہ پر نواب صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں اچکن کے کپڑے کی قیمت تھی جو سب سے بڑے درزی اور اس کے دوست نے دیوان جی سے وصول کی تھی۔ ماسٹر رمضان نے وہ رقم نواب صاحب کو دیتے ہوئے کہا :

"حضور! یہ کپڑے کی قیمت ہے۔"

نواب صاحب نے ماسٹر رمضان سے روپے لینے کے بعد چھوٹے نواب کو آواز دی۔ جب چھوٹا نواب آیا تو اس نے وہی اچکن پہن رکھی تھی۔

نواب صاحب نے کہا :

"ماسٹر رمضان! چھوٹے نواب کی اچکن دیکھی؟"

"دیکھی ہے عالی جاہ!" اس نے جواب دیا۔

"کیسی ہے؟" انہوں نے طنز سے کہا۔

"حضور! بالکل ویسی ہے۔"

ماسٹر رمضان بولا۔

"کیا مطلب؟" نواب صاحب کا موڈ ایک دم بگڑ گیا۔

"حضور! میرا مطلب ہے اس اچکن میں اور میری سلی ہوئی اچکن میں ذرا فرق نہیں۔"

نواب صاحب کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ انہوں نے بڑے غصے سے کہا :

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس میں بھی کوئی نقص ہے؟"

"حضور! اس میں کوئی نقص نہیں۔" ماسٹر رمضان نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "یہ بڑی خوب صورت سلی ہوئی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ وہی اچکن ہے تو غلط نہ ہوگا۔"

"ہونھ .....!" نواب صاحب نے غصے سے تلملا کر کہا۔ "تم ہماری توہین کر رہے ہو۔

شاید تمہیں معلوم نہیں کہ یہ اچکن ہم نے زری ہاؤس سے کل ہی بنوائی ہے اور ہمیں اس کی قیمت چار گنا ادا کرنی پڑی ہے۔"

"حضور! آپ اجازت دیں تو کچھ عرض کروں۔"

"کہو کہو ..... جلدی کہو۔" نواب صاحب بہت غصے میں تھے۔

"جناب عالی! یہ وہی اچکن ہے جو اس گناہ گار نے تیار کی تھی اور اسی قیمت پر آپ تک پہنچی ہے جو اس کی صحیح قیمت ہے۔ بقایا تین گنا رقم اس شخص کی جیب میں ہے جو کہ یہ اچکن خریدنے گیا ہوگا۔"

"اس کا ثبوت؟" نواب صاحب زور سے گرجے۔

"حضور! میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں۔"

نواب صاحب غصے سے چلائے :

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس ..... جلدی بتاؤ ..... ورنہ ..... ورنہ .....!"

"جناب والا! اسی اچکن کی داہنی جیب کی سلائی ادھیڑ کر دیکھ لیں۔ آپ کو اس کا پورا ثبوت مل جائے گا کہ یہ اچکن میری سلی ہوئی ہے اور اپنی اصلی قیمت پر فروخت ہوئی ہے۔"

ماسٹر رمضان نے کہا۔

نواب صاحب نے جلدی جلدی غصے میں چھوٹے نواب کی اچکن اتروا کر اس کی جیب ادھیڑی اور اس میں سے ایک رقعہ نکال لیا۔

رقعے میں لکھا تھا :

"جناب عالی! یہ اچکن ماسٹر رمضان کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ہے' جسے آپ نے دیوان جی کے کہنے پر ناپسند فرمایا تھا۔ اب یہ اچکن اپنی اصلی قیمت پر آپ کے ہاتھ بکی ہے اور آپ کو اس لئے پسند ہے کہ اسے دیوان جی نے شہر کی سب سے بڑی دکان سے خریدا ہے اور زیادہ قیمت پر خریدا ہے۔ اس اچکن کے لئے اصل قیمت سے ایک پائی زیادہ نہیں لی گئی۔ آپ کے دیوان جی بقایا رقم کھا چکے ہیں اور اسی لئے انہوں نے میرے ہاتھ کی سلی ہوئی اچکن ناپسند بھی کی تھی۔ امید ہے کہ آپ میری اس گستاخی کو معاف فرمائیں گے۔" آپ کا خادم' ماسٹر رمضان

نواب صاحب رقعہ پڑھ کر ساری بات سمجھ گئے اور انہوں نے ماسٹر رمضان کو گلے لگالیا اور اس کی تنخواہ کئی گنا بڑھا دی اور دیوان جی کو بہت سا جرمانہ کرکے نوکری سے نکال دیا۔

پہلی بار

محمد صابر

کش مکش کی اس دنیا میں ہر خاص و عام کام کسی نہ کسی نے پہلی بار ضرور کیا تھا۔ ایسا کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور کیا کیا ہوا؟ تاریخ کے صفحات سے یہ منفرد اور حیرت انگیز معلومات آنکھ مچولی کے قارئین کی دلچسپی کی نذر ہیں۔

انگلش چینل دنیا کی مصروف ترین آبی گزرگاہ ہے۔ بروجن داس انگلش چینل کو تیر کر عبور کرنے والے پاکستان کے پہلے شخص ہیں۔ بروجن داس کے علاوہ پاکستان کے ایک اور تیراک عبدالمالک بھی انگلش چینل کو تیر کر عبور کرنے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

☆---☆---☆

دنیا کا پہلا فلم اسٹوڈیو قائم کرنے کا سہرا نامور سائنس دان تھامس ایڈیسن کے سر ہے۔ انہوں نیوجرسی کے مقام ویسٹ اورنج میں کثیر لاگت سے ایک اسٹوڈیو تعمیر کیا جو (Girl Country) کے نام سے معروف ہوا۔

☆---☆---☆

دنیا کی سب سے قیمتی کار رولس رائس پہلی بار ۱۹۰۴ء میں مانچسٹر میں بنائی گئی۔ رولس رائس کار متعارف کرانے کا اعزاز ایل ایس رولس (L.S. Rolls) اور ایف ایچ رائس (F.H.Royce) کو حاصل ہے اور اس کار کا نام بھی اس کے بنانے والوں کے نام کی مناسبت سے رولس رائس رکھا گیا۔

☆---☆---☆

۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو جاپان میں این - ٹی وی (N.T.V) کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کا پہلا اور واحد کوئز پروگرام منعقد کیا گیا جو شرکائے مقابلہ

کی تعداد کے اعتبار سے اب تک منعقد ہونے والا دنیا کا سب سے بڑا کوئز پروگرام ہے۔ اس پروگرام میں جو کہ آل جاپان ہائی اسکول چیمپئن شپ کے نام سے منعقد کیا گیا۔ اسی ہزار سات سو ننانوے (۸۰،۷۹۹) افراد نے شرکت کی۔

☆---☆---☆

جان بارڈین دو مرتبہ ایک ہی شعبے میں نوبل انعام حاصل کرنے والے دنیا کے پہلے شخص ہیں۔ انہیں ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۲ء میں فزکس کے شعبے میں غیر معمولی خدمات انجام دینے پر "نوبل انعام" دیا گیا۔

☆---☆---☆

دنیا کی مشہور آبشار اینجل (Angel) کو ۱۹۱۰ء میں پہلی بار (ErnestoSanches) نامی شخص نے دریافت کیا۔ اس آبشار کا پورا نام (Salto Angel) ہے اور یہ وینزویلا کے مشرق میں واقع ہے۔ آبشار اینجل کی بلندی ۳،۲۱۲ فٹ ہے۔

☆---☆---☆

خلاء کی وسعتوں کو مسخر کرنے کا باقاعدہ آغاز ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء کو ہوا جب سابق سوویت یونین نے اپنا خلائی جہاز وو سٹوک اول پہلی بار خلاء میں بھیجا۔ اس خلائی جہاز میں سابق سوویت یونین کے خلاء باز پوری گیگارین سوار تھے اس طرح پوری گیگارین دنیا کے سب سے پہلے خلا باز قرار پائے۔

☆---☆---☆

امریکہ کے پہلے نائب صدر جان ایڈمز تھے۔ وہ ۱۷۸۹ء میں امریکہ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ بعدازاں امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی موت کے بعد امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ جان ایڈمز واحد امریکی صدر ہیں جن کے صاحبزادے جان کوئنسی ایڈمز بھی امریکہ کے صدر بنے۔

☆---☆---☆

دنیا کی سب سے بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ ۲۹۰۲۸ فٹ بلند یہ چوٹی پہلی بار ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء میں سر کی گئی اور اسے سر کرنے کا

اعزاز ایڈمنڈ ہلاری کو حاصل ہے۔ خواتین میں یہ اعزاز "جن کوتبائی" کو حاصل ہوا۔ وہ پہلی جاپانی خاتون ہیں جنہوں نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔

☆---☆---☆

کے ٹو (K2) دنیا کی دوسری اور پاکستان کی بلند ترین چوٹی ہے۔اس کا تعلق مشہور پہاڑی سلسلے قراقرم سے ہے۔ کے ٹو (K2) کو "چوگوری" اور "ماؤنٹ گوڈون آسٹن" بھی کہا جاتا ہے ۲۵۰، ۲۸ فٹ بلند یہ چوٹی ۳۱ جولائی ۱۹۵۴ء میں پہلی بار سر کی گئی اور یہ اعزاز اٹلی کے کوہ پیماؤں نونی اور لیس ڈیلی کے حصے میں آیا۔

☆---☆---☆

انگلینڈ کے نامور کرکٹر فریڈی ٹرومین ٹیسٹ کرکٹ میں ۳۰۰ وکٹیں حاصل کرنے والے پہلے کھلاڑی ہیں۔ انہوں نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز ۱۹۲۵ء میں کیا اور ۱۹۶۵ء تک ٹیسٹ کرکٹ میں سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے اپنے ٹیسٹ کیریئر میں ۶۷ میچ کھیل کر ۳۰۷ وکٹیں حاصل کیں جبکہ ان کا بالنگ اوسط ۲۱.۵۷ تھا۔

☆---☆---☆

لان ٹینس کا عالمی مقابلہ "ومبلڈن ٹینس چیمپئن شپ" کے نام سے ہر سال کھیلا جاتا ہے۔ جس میں ٹینس کے شہرہ آفاق کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ ومبلڈن ٹینس چیمپئن شپ پہلی بار ۱۸۷۷ء میں کھیلی گئی۔ اس چیمپئن شپ میں صرف مرد کھلاڑی شریک تھے جبکہ خواتین کی پہلی عالمی چیمپئن شپ ۱۸۸۴ء میں منعقد ہوئی۔

☆ --- ☆ --- ☆

پاکستان کا پہلا آئین ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کیا گیا۔ یہ آئن تحریری تھا جو ۲۳۴ دفعات پر مشتمل تھا اور اس کی ضخامت تقریباً تین سو صفحات تھی۔ آئین ساز اسمبلی نے ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو تقریباً" دو ماہ کی قلیل مدت میں اسے منظور کیا۔

☆---☆---☆

پاکستان کے پہلے آئین میں کئی اسلامی دفعات موجود تھیں۔ اس آئین کی رو سے پاکستان کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" رکھا گیا۔ اس آئین میں پارلیمانی نظام حکومت کے قیام پر زور دیا گیا تھا جس کے تحت صدر ملک کا آئینی سربراہ تھا جبکہ انتظامیہ کے اختیارات وزیراعظم کی سربراہی میں کابینہ کو حاصل تھے۔

☆---☆---☆

رہبرِ اول پاکستان کا پہلا موسمیاتی راکٹ تھا جو ۷ جون ۱۹۶۲ء کو کراچی سے ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع سونمیانی کے مقام سے چھوڑا گیا۔ یہ راکٹ تقریباً ۸۰ میل کی بلندی تک گیا۔ اور اس کی رفتار ۲ ہزار چار سو میل فی گھنٹہ تھی۔ اس راکٹ کی کامیاب پرواز میں پاکستان ایٹمی توانائی۔کمیشن کے آفیسر طارق مصطفےٰ اور محکمہ موسمیات کے ڈائریکٹر ایم رحمت اللہ کی کوششیں نمایاں تھیں۔

☆---☆---☆

جاپان ٹیلی وژن سے وابستہ صحافی توھیرو اکی یاما (Tohero Akiyama) شعبۂ صحافت سے تعلق رکھنے والے دنیا کے پہلے شخص ہیں جو خلاء میں بھیجے گئے۔ انہوں نے ۳ دسمبر ۱۹۹۰ء کو سابق سوویت یونین کے خلابازوں کے ہمراہ خلائی جہاز سویوز ٹی ایم کے ذریعے خلاء کا سفر کیا۔

☆---☆---☆

دنیا کے پہلے ومبلڈن چیمپئن ہونے کا اعزاز برطانیہ کے اسپنسر ڈبلیو گور کو حاصل ہے۔ جبکہ خواتین کی پہلی ومبلڈن چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز برطانیہ ہی کی خاتون موڈ واٹسن کو حاصل ہے۔ برطانیہ ہی کے ولیم چارلس وین شایہ اعزاز سات مرتبہ حاصل کرنے والے پہلے اور واحد کھلاڑی ہیں۔ انہوں نے یہ اعزاز ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۶ء تک مسلسل چھ مرتبہ اور ۱۸۸۹ء میں ساتویں مرتبہ حاصل کیا۔

☆---☆---☆

بھارت سے تعلق رکھنے والی خاتون سیاست دان وجے لکشمی پنڈت اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی صدارت کرنے والی دنیا کی پہلی خاتون تھیں۔ وہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہیں۔ مسز وجے لکشمی پنڈت بھارت کے سابق وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو کی ہمشیرہ تھیں۔ ان کا انتقال یکم دسمبر ۱۹۹۰ء کو ہوا۔

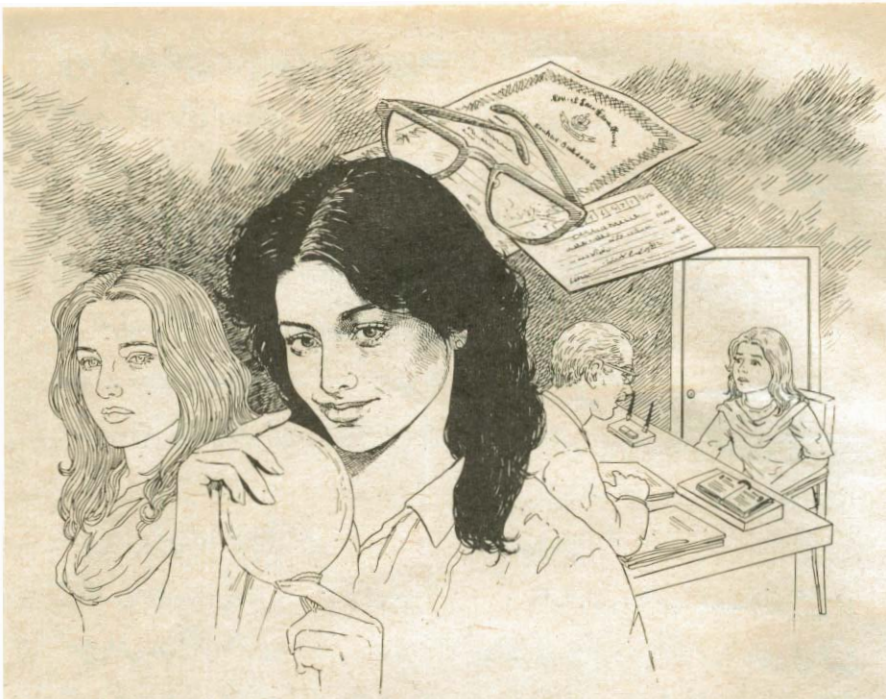

کرسی

محمد جاوید خالد

"نسرین، نسرین اری او کام کرنے کی مشین کہاں ہے تو؟"

سلائی مشین پر جھکی ہوئی نسرین نے ایک لمحے کو سر اٹھایا اور مسکرا دی۔ ان الفاظ، اس آواز اور اس لہجے کو وہ ہزاروں کیا لاکھوں میں شناخت کرسکتی تھی۔ یہ آواز شاہین کی تھی۔

شاہین اس کی خالہ زاد بہن تھی۔ رشتہ ہی بے تکلفی کا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ دونوں ہم عمر تھیں۔ چنانچہ دونوں میں گہری دوستی بھی تھی۔ تکلف سے پاک 'تو' تجھے والی دوستی۔

اس گہری دوستی کے باوجود دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نسرین قناعت

پسند تھی اور شاہین سرتاپا بے قراری۔ نسرین عام طور پر سنجیدہ رہتی اور شاہین کو سنجیدگی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ کسی ہنسی کی بات پر بھی نسرین کے ہونٹ بس اتنے ہی کھلتے کہ سامنے کے دو چمکدار دانت نظر آجاتے اور شاہین کا حال یہ تھا کہ صرف مسکرانے کی بات پر اس کے قہقہوں سے در و دیوار گونجتے تھے۔ لیکن مزاجوں کا اختلاف اپنی جگہ' دونوں میں دوستی تھی اور پکی دوستی۔

شاہین جب آتی' اودھم مچاتی آتی۔

"مجھے دیواریں بتا دیتی ہیں کہ تم آرہی ہو۔" نسرین اس سے اکثر کہا کرتی۔

"اور تمہارے ہاں قبرستان کی سی خاموشی مجھے بتاتی ہے کہ تم کام میں مصروف ہو۔" شاہین کا جواب ہوتا۔

"شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کرلینی چاہئے۔" نسرین حملہ کرتی۔

"اور بات اچھی نہ ہونے کا مطلب ہے کہ شکل ماشاءاللہ اچھی ہے۔" شاہین منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیتی۔ نسرین اس پر اپنی عادت کے مطابق دھیرے سے مسکرا دیتی اور اس کو لاجواب پاکر شاہین کا قہقہہ بلند ہوجاتا۔ اتنا بلند کہ منڈیر پر بیٹھی ہوئی چڑیاں گھبرا کر اڑ جاتیں۔

مسکرا کر نسرین پھر مشین پر جھک گئی لیکن مشین کی آواز پر شاہین کی آواز غالب آگئی۔

"نسرین اری او کام کرنے کی مشین کہاں ہے تو؟" پھر ایڑیوں کی کھٹ کھٹ نسرین کے پاس آکر رک گئی۔ نسرین نے سر اٹھائے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آنکھیں بھینس جیسی موٹی نہ سہی' موٹے موٹے شیشوں کی عینک تو آنکھوں پر لگی ہے نا اس پر بھی نظر نہیں آرہا کہ مابدولت یہاں تشریف فرما ہیں۔"

"اے ماں بدولت' ایک منٹ میں ابا بدولت بنادوں گی۔ سر اٹھاؤ اور انسانوں کی طرح پیش آؤ۔" شاہین نے انگوٹھے سے اس کی پیشانی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"انسانوں کی طرح تو کسی انسان سے ہی پیش آیا جائے گا۔" نسرین سر اٹھا کر مسکرائی لیکن جیسے ہی اس کی نظر شاہین پر پڑی' مارے حیرت کے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہائیں تمہاری عینک کہاں گئی؟"

"اب مسکرانے کی باری شاہین کی تھی۔ وہ آلتی پالتی مار کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور چمکتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ نسرین حیرت کی تصویر بنی اسے گھور رہی تھی کیونکہ شاہین کے

بارے میں مشہور تھا کہ پچھلے دس سال سے کسی نے اسے عینک کے بغیر نہیں دیکھا۔ رات گئے کا وقت ہو یا صبح سویرے کا' شاہین کی مختصر ناک پر ایک بڑی سی عینک ضرور نظر آتی بلکہ نسرین تو اسے یہ کہہ کر چھیڑا کرتی تھی کہ "تم تو سوتی بھی عینک لگا کر ہو تاکہ خواب اچھی طرح دیکھ سکو۔"

نسرین نے پہلے تو دونوں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو مل مل کر شاہین کی طرف دیکھا پھر تین انگلیاں بند کرکے ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگی۔ شاہین بدستور مسکرا رہی تھی۔ "مجھے تو مکھی کا وہ نشانِ محبت بھی نظر آرہا ہے جو اس نے ابھی ابھی تمہاری سفید قمیض کے اس طرف کے دامن پر چھوڑا ہے۔" شاہین نے اشارہ کیا تو نسرین نے گھبرا کر اُدھر دیکھا۔ پھر اس نے اڑتی ہوئی مکھی کو مارنے کی ناکام کوشش کی تو شاہین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے ہنسنے سے نسرین جھینپ سی گئی۔ "یہ کیا جادو ہے آپا جان؟" اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لئے شاہین کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"خبردار! جو مجھے آپا جان کہا' میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے۔"

"مگر دو مہینے پہلے تک تو محترمہ آپ مجھ سے لڑا کرتی تھیں کہ آپ کو آپا جان کہا جائے؟"

"وہ بات اور تھی۔"

"اب بات اور ہے نا؟ اب کیا کہا جائے جناب کو؟"

"ارے بھئی شاہین کہو اور کیا کہنا ہے ویسے چاہو تو مختصراً "حنا بھی کہہ سکتی ہو۔"

"حنا بھی کہہ سکتی ہو۔" نسرین نے منہ ٹیڑھا کرکے اس کی نقل اتاری۔ "شاہی سپاری کہوں گی میں تو تم کو۔"

شاہین اس پر ہنس پڑی اور نسرین پر ایک دفعہ پھر حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ یہ وہی شاہین تھی جو اپنی اس چڑ پر اسے مارنے دوڑتی تھی۔ اسے شرم دلایا کرتی تھی کہ "احترام سیکھو' فرق فرق ہوتا ہے' چاہے چار دن ہی کا کیوں نہ ہو۔"

بات یہ تھی کہ دونوں لڑکیاں تھیں تو ہم عمر مگر شاہین نسرین سے صرف چار دن بڑی تھی اور اب سے پہلے اس بڑی ہونے کا احساس کا غلبہ اس پر اکثر رہتا تھا۔ "مجھے آپا جان کہا کرو۔" وہ خود کہا کرتی اور جہاں نسرین نے بے تکلفی سے اس کا نام بگاڑا وہاں وہ اخلاقیات کی استاد بن جایا کرتی۔ تنگ کر نسرین کہتی۔ "کیا ہے؟ چار ہی دن تو بڑی ہو' اس چار دن کی حکومت پر اِتراؤ نہیں' چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے۔" مگر اب تو پچھلے دو مہینوں سے گویا انقلاب

آگیا تھا۔ ایسا انقلاب!!! نسرین بے چاری تو بس حیرت ہی کرتی رہ جاتی۔ آپا جان کہلوانے والی آپا جان کہنے سے بگڑ رہی تھی اور نام بگاڑنے پر جو بگڑ بگڑ جاتی تھی وہ کھلکھلا رہی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں بغیر عینک کے؟" شاہین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"باؤلی لگ رہی ہو بغیر عینک کے۔" نسرین نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ "چار دن کی بڑی چار سال چھوٹی لگ رہی ہو مجھ سے۔"

"وہ مارا۔" شاہین نے نعرہ لگایا۔ "یہی تو مقصد تھا۔"

"یہی تو مقصد تھا؟" نسرین نے حیرت سے اس کا جملہ دہرایا۔

شاہین نے پرس کھولا، شناختی کارڈ نکالا اور حیرت سے ہونق بنی نسرین کے ہاتھ میں دے دیا۔ کچھ نہ سمجھتی نسرین نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پڑھنا شروع کردیا۔ تاریخ پیدائش پر وہ رک گئی۔ دس اکتوبر انیس سو ستتر، "شاہین یہ تو غلط لکھا ہوا ہے۔"

"نہیں، اب یہی ٹھیک ہے۔" شاہین مسکرائی۔

"مگر تمہارا سالِ پیدائش تو انیس سو بہتر ہے۔"

"ہے نہیں تھا۔ میں نے دوسرا جنم لیا ہے۔"

نسرین کچھ دیر تو اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ تشویش بھی تھی۔ "ٹھہرو میں تم پر آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "بے وقوف لڑکی! میں ہوش و حواس میں ہوں۔" شاہین ہنستی ہوئی بولی۔ "میں نے خود سے شناختی کارڈ پر عمر کم لکھوائی ہے۔"

"کم لکھوائی ہے؟ مگر کیوں؟"

"کم سن بننے کے لئے اور کم سن نظر آنے کے لئے ہی عینک سے جان چھڑا کر آنکھوں میں شیشے لگوالئے ہیں۔ اچھا یہ پاگلوں کی طرح مجھے گھورو نہیں میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔ تم جانتی ہو نوکری کرنا میری مجبوری ہے اور یہ بھی جانتی ہو کہ میں اپنی موجودہ پرائیویٹ نوکری سے مطمئن نہیں ہوں۔ پیسے بہت کم، کام بہت زیادہ اور وقت سارا دن خدا کی پناہ، مجھے اب گورنمنٹ جاب کرنا ہے اور تم تو بی بی گھر کی چوکھٹ گھر کے اندر، تمہیں کیا معلوم باہر کی دنیا کے کیا کیا قانون ہیں؟"

"اچھا تو تم نے یہ کم سنی گورنمنٹ جاب کے لئے اختیار کی ہے۔" نسرین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "مگر میٹرک ہم نے انیس سو ستاسی میں کیا تھا۔ گورنمنٹ یہ نہیں پوچھے گی کہ بی بی! تم نے دس سال کی عمر میں دس جماعتیں کیسے

پاس کرلیں؟"

"اس کا حل بھی ڈھونڈ لیا ہے محترمہ!" شاہین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میٹرک کی مارک شیٹ پر لکھے ہوئے سال ۸۷ کو ہلکا ہلکا مٹا لیا ہے۔ اس کی فوٹو کاپی پر ۹۳ ہاتھ سے لکھ لیا جائے گا۔ پھر اس کی کاپی نکلوا کر تصدیق (Attest) کروالوں گی۔ تصدیق وہی اپنے سراج بھائی سے، ادھر ادھر کی باتوں میں انہیں پروا ہی نہیں ہوگی کہ اتنی باریک بینی سے اس کا جائزہ لیں۔"

"گویا ایک جھوٹ کے لئے دس جھوٹ والی بات آپ نے سچ ثابت کردی۔" نسرین نے کہا "یہ جھوٹ نہیں، نظریۂ ضرورت ہے۔ ہمارے چھوٹے سے شہر کے اکلوتے ایجوکیشن آفس میں جونیئر اسسٹنٹ کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ میں نے معلومات لے لی ہیں۔ میڈم کے ذریعے ہلکی پھلکی سفارش بھی ہوجائے گی۔ ڈی ای او انٹرویو کے لئے آرہے ہیں۔ بس عمر کا مسئلہ کھڑا ہورہا تھا۔ وہ میں نے حل کرلیا ہے۔" شاہین نے وضاحت کی۔

"خیر نظریۂ ضرورت ہو یا کوئی اور صورت، جھوٹ تو جھوٹ ہی کہا جائے گا۔ مجبوری کے عالم میں نوکری نہ کرنے والے یا جن کو گورنمنٹ جاب نہیں ملتی، مرتے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رزق پہنچانے کے سینکڑوں طریقے بنائے ہیں۔"

"اب تم کہو گی کہ تمہیں گھر بیٹھے سلائی کڑھائی کے ذریعے رزق ملتا ہے۔"

"یہ بھی ایک طریقہ تو ہے۔" نسرین نے مسکراتے ہوئے سرہلایا۔

"اچھا خیر مولوی صاحب، بلکہ مولون صاحبہ آپ سے بحث کیا کرنی؟ کل انٹرویو ہے اور آپ کو اس بڑے کام میں حوصلہ و تسلی کے لئے ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"بڑے کام نہیں، بڑے فراڈ میں کہو۔" نسرین نے چوٹ کی۔

"اچھا تم اس کی فکر چھوڑو اور اپنی فکر کرو۔" شاہین مسکرائی۔

"مجھے کیا پڑی ہے فکر کروں؟" نسرین نے کہا۔ "جھوٹ اور گناہ سب تمہارے سر۔ تم اپنی جو بھی عمر بتاؤ گی مجھے تو بس یہی کہنا ہوگا کہ "بندی ان سے چار دن چھوٹی ہے۔" "اور چار گز لمبی زبان رکھتی ہے۔" شاہین نے جل کر کہا اور نسرین قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

وہ دونوں وقت سے کچھ پہلے ہی ایجوکیشن آفس میں پہنچ گئی تھیں۔ کچھ دیر میں میڈم بھی آگئیں۔ ڈی ای او بھی پہنچ گئے۔ میڈم نے بتایا

کہ وہ براہ راست ڈی ای او سے واقف تو نہیں ہیں۔لیکن انہوں نے شاہین کو تسلی دی "تم انٹرویو تو ہوشیاری سے اور ذمہ داری سے دو کہنے سننے کی ضرورت پڑی تو میں بات کرلوں گی۔" نسرین نے انٹرویو کے برابر والے کمرے کا' اس اثناء میں جائزہ لے لیا تھا۔ جہاں سے وہ نہ صرف انٹرویو کی کارروائی سن سکتی تھی بلکہ تھوڑی سی مشقت سے دیکھ بھی سکتی تھی۔ شاہین جوں ہی کمرۂ انٹرویو میں داخل ہوئی نسرین چھپاک سے برابر والے کمرے میں گھس گئی۔

"تو آپ ہیں شاہین صدیقی۔" ڈی ای او نے اس کی درخواست دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی سر۔" نسرین نے دیکھا صدیقی کے لفظ پر شاہین کچھ گھبرا سی گئی تھی۔"نام کام سے نہیں مل رہا نا اس لئے" اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔

"آپ کی عمر؟ اچھا انیس سو ستتر میں پیدا ہوئیں آپ' تو گویا عمر آپ کی ہوئی انیس سال؟" ڈی ای او نے ناک پر رکھے ہوئے چشمے کے اوپر سے شاہین کو جھانکا۔

"جی سر۔" شاہین کی آواز کانپ رہی تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ "بے چاری۔" نسرین نے سوچا۔ "بی بی' اب آپ کا انٹرویو کیا ہو؟" ڈی ای او نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "دراصل اس سے پہلے کا ہمارا تجربہ ناکام ہوگیا تھا۔ چنانچہ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سیٹ پر کسی میچور اور سنجیدہ امیدوار کو بٹھائیں گے' جس کی عمر کم از کم چوبیس پچیس سال تو ہو۔ اس سیٹ کے لئے آپ ابھی کم سن ہیں۔آپ سمجھ رہی ہیں نا؟!!"

"جی ..... جی سر۔" شاہین کی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور نسرین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کھلکھلا کر قہقہہ لگائے یا منہ بنا کر' باہر آنے والی شاہین سے اظہارِ ہمدردی کرے۔ ●●

آنکھیں

آنکھیں انسان کی قلبی کیفیت کی صحیح ترجمان ہوتی ہیں زبان کو بند رکھا جاسکتا ہے مگر آنکھوں میں لکھی تحریروں کو چھپانا بہت مشکل ہے۔ پھولوں کی خوشبو کو ناک سے سونگھا جاتا ہے اس کے برعکس آنکھوں کی خوشبو کو دل سے محسوس کیا جاتا ہے سچی آنکھیں دل کی خوبصورتی کی عکاس ہوتی ہیں۔

علامہ اقبال

منیر احمد فردوس

علامہ اقبال کی زندگی کے بارے میں اتنی بہت ساری معلومات ممکن ہے آپ نے اس سے قبل کسی ایک مضمون میں نہ پڑھی ہوں ڈیرہ اسماعیل خان کے منیر احمد فردوس نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد یہ مضمون مرتب کیا اور اسے بطور خاص آنکھ مچولی کے قارئین کے لئے بھجوایا۔

آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا میں علامہ اقبال کی پیدائش بمطابق ۱۸۷۶ء کو ہوئی۔ روزنامہ "انقلاب" ۷ مئی ۱۹۳۸ء کے شمارے میں اور مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی ایک کتاب میں علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بتائی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال کو جاری کئے جانے والے بین الاقوامی پاسپورٹ میں علامہ اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۶ء درج ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ۹۷ - ۱۸۹۶ء کے کیلنڈر کے صفحہ نمبر ۳۴۸ پر علامہ اقبال کے امتحانی اندراجات

کے مطابق جس وقت یونیورسٹی نے علامہ کو امتحان میں داخلہ کی اجازت دی تھی تو اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال تھی۔ اس حساب سے اس کے نتائج کے اعلان کے وقت علامہ کی عمر ۲۰ سال ٹھہرتی ہے۔ اس دستاویز کے مطابق علامہ اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔ فقیر سید وحید الدین نے علامہ کے خاندان کے ارکان کی شہادتوں کی بنیاد پر جو تاریخ اور سن متعین کیا ہے وہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ بہرحال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی صحیح تاریخ تسلیم کی جاتی ہے اور حکومت پاکستان سرکاری طور پر اس روز "یوم اقبال" مناتی ہے۔

آپ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو بروز جمعہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا مقام پیدائش اقبال منزل بازار چوڑیگراں (اب موجودہ نام "اقبال بازار") ہے۔

آپ کے دادا کا نام شیخ محمد رفیق اور پردادا کا نام شیخ جمال دین تھا۔ آپ کے دادا کشمیری دھسوں کی تجارت کیا کرتے تھے اور دھسوں کی تجارت نے ہی آپ کے خاندان کو مالی طور پر مستحکم کیا۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ آپ اپنی والدہ کو بے جی کے نام سے پکارتے تھے۔

علامہ اقبال کی ولادت سے پہلے ان کے والد نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ ایک سفید کبوتر فضائے آسمانی میں پرواز کر رہا ہے۔ پھر وہ کبوتر نیچے اترا اور آپ کے والد کی گود میں آ اترا۔ اس خواب سے ان کے والد نے سمجھ لیا کہ ان کے ہاں جو بچہ ہوگا وہ بااقبال ہوگا۔ آپ کا نام "محمد اقبال" آپ کی والدہ ماجدہ امام بی بی نے رکھا تھا۔ آپ کل تین بھائی تھے۔ آپ سے بڑے بھائی کا نام شیخ عطا محمد تھا، لیکن ایک بھائی کمسنی ہی میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ آپ کی ۴ بہنیں تھیں۔ زینب بی بی، کریم بی بی، فاطمہ بی بی اور طالعہ بی بی۔ دو بہنیں آپ سے بڑی اور دو چھوٹی تھیں۔ آپ کا خاندان برہمن کشمیری کہلاتا تھا۔ آپ نے درس قرآن پاک سے تحصیل علم کا سلسلہ مسجد حسام الدین محلہ کشمیریاں سیالکوٹ سے شروع کیا۔ سب سے پہلے استاد مولانا غلام حسن تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ سے حاصل کی۔ یہاں آپ کو استاد فاضل مولوی سید میر حسن کی صحبت حاصل ہوئی۔ جن کے متعلق آپ نے اپنے ایک شعر میں فرمایا تھا:

قفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نقطہ داں مجھ کو

پرائمری جماعت کا امتحان ۱۸۸۸ء میں، مڈل

کا امتحان ۱۸۹۱ء میں اور میٹرک کا امتحان ۱۸۹۳ء میں گجرات سینٹر سے پاس کیا اور آپ نے پرائمری، مڈل اور میٹرک میں وظائف بھی حاصل کئے۔ علامہ اقبال کو میٹرک میں پاس ہونے کی خبر ان کی پہلی شادی کے وقت بارات روانہ ہونے سے قبل ملی۔ ایف اے کا امتحان آپ نے ۱۸۹۵ء میں اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا، بعد میں اس کا نام مرے کالج ہوگیا۔ بی اے کا امتحان آپ نے ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ۲۶۰ نمبرز لے کر سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ بی اے میں آپ کے مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔ عربی اور انگریزی میں اول آنے پر آپ کو دو تمغے "پی ایس جمال دین میڈل" اور "خلیفہ محمد حسین میڈل" دیئے گئے۔

۱۸۹۹ء میں علامہ اقبال نے فلسفہ میں ایم اے کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ لیکن تھرڈ ڈویژن لینے کے باوجود بھی آپ کو طلائی تمغہ "خان بہادر نواب بخش میڈل" سے نوازا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبال اس سال فلسفے کے امتحان میں پاس ہونے والے واحد امیدوار تھے۔ فلسفے میں آپ کے استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ تھے۔ آپ کی ذہانت سے متاثر ہوکر پروفیسر آرنلڈ نے آپ کے بارے میں کہا تھا کہ "ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنادیتا ہے۔" ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء میں علامہ اقبال اورینٹل کالج میں ۱۰۰ روپے ماہوار پر میکلوڈ عربیک ریڈر مقرر ہوئے۔ مئی ۱۹۰۳ء تک آپ ریڈر رہے۔ اس دوران آپ اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے بلا تنخواہ کے تدریس پر بھی مامور ہوئے۔ جون ۱۹۰۳ء میں آپ اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ مقرر ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک آپ نے پروفیسری کی۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لئے آپ گورنمنٹ کالج سے ۳ سال کی اسٹڈی لیو لے کر انگلینڈ چلے گئے۔ انگلینڈ جانے سے پہلے آپ نے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی اور اپنی ایک نظم "التجائے مسافر" بھی پڑھی۔ انگلینڈ میں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی انگلستان کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں آپ کے استاد ڈاکٹر مک ٹیگرٹ تھے۔ یورپ میں تین سال کے قیام کے دوران ۱۹۰۸ء میں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا اور میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ پی ایچ ڈی ہی کی وجہ سے آپ کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ وکالت پاس کرنے کے بعد آپ واپس پاکستان آئے اور لاہور میں وکالت شروع کردی۔ وکالت شروع

کرنے پر آپ کے منشی طاہر الدین مقرر ہوئے۔ پریکٹس کے لئے آپ نے چیف کورٹ کا انتخاب کیا۔ کورٹ آپ اپنی ذاتی بگھی میں بیٹھ کے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۴ء تک آپ نے وکالت جاری رکھی۔ آپ عموماً" پنجابی اور اردو میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ جس میں انگریزی کے الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔ علامہ اقبال کی تعلیم ایم اے فلسفہ' پی ایچ ڈی اور بیرسٹرائیٹ لاء تھی۔ اساتذہ کی قدر آپ کے دل و دماغ میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حکومت برطانیہ نے آپ کو "سر" کا خطاب دینا چاہا تو علامہ اقبال نے یہ شرط پیش کی کہ پہلے میرے استاد مولوی سید میر حسن کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا جائے۔ اس پر گورنر پنجاب نے پوچھا کہ مولوی صاحب کی اہم تصانیف کونسی ہیں۔ آپ نے اس پر جواب دیا "کوئی نہیں البتہ ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے کھڑی ہے۔" ۱۹۲۲ء میں حکومت نے آپ کو "سر" کے خطاب سے نوازا۔ سر کا خطاب ملنے پر ہندو' مسلم اور سکھ معززین نے آپ کو جہانگیر کے مقبرہ پر پارٹی بھی دی۔ سر کے علاوہ اقبال کو حکومت برطانیہ نے "شمس العلماء" اور "روبرو خان بہادر" کے خطابات سے بھی نوازا تھا۔ لیکن آپ نے ان خطابات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ ان خطابات سے مشہور نہیں ہو سکے۔

مولانا محمد علی جوہر نے آپ کو "مرشد سیاسی" خواجہ حسن نظامی نے "حکیم الامت" اور مولانا شبلی نعمانی نے "ملک الشعراء" جیسے القابات سے نوازا۔

آپ مولانا رومی کو اپنا روحانی استاد تسلیم کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی ہر کتاب میں مولانا رومی کا ذکر کیا ہے۔

آپ کی زندگی میں سیاحت کا بھی عمل دخل ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو سیاحت کا بھی بہت شوق تھا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو آپ مصر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے پانچ روز تک قیام کیا' ۳ دسمبر کو آپ نے اہرام مصر کی سیر کی' ۴ دسمبر کو آپ نے آثار قدیمہ دیکھے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو آپ روم تشریف لے گئے روم میں اٹلی کے قیام کے دوران آپ غرناطہ' میڈرڈ اور اشبیلہ شہروں میں گئے۔ یہاں آپ نے مولانا شوکت علی اور مولانا زاھد علی سے بھی ملاقات کی۔ آپ نے جزیرہ سسلی کے بارے میں نظم "صقلیہ" بھی کہی۔ جو بانگِ درا میں شامل ہے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو آپ نے اٹلی کے مشہور لیڈر

مسولینی سے بھی ملاقات کی جو کہ ۴۰ منٹ تک جاری رہی۔ ۱۹۳۳ء میں آپ اسپین بھی گئے۔ اسپین کی مشہور مسجد "قرطبہ" میں علامہ اقبال نے اذان بھی دی اور نماز بھی پڑھی۔ اسپین کی عظیم الشان عمارت "الحمرا محل" اقبال کو ازحد پسند آئی۔

علامہ اقبال کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی شاعری کا ابتدائی دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک ہے۔آپ دوران تعلیم ہی ادبی محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ آپ لاہور شہر سے ہی شاعر کے طور پر ابھر کر نمایاں طور پر سامنے آئے۔ آپ نے ابتدائی شاعری میں مشہور شاعر "داغ" سے اصلاح لی۔ آپ داغ سے خط و کتابت کے ذریعے اصلاح لیتے تھے۔ ایک دفعہ داغ نے اقبال کی ایک نظم یہ کہہ کر واپس کردی تھی کہ اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ ابتدائی شاعری میں اس وقت کے مشہور شاعر ارشد گورگانوی نے آپ کی شاعری سے متاثر ہو کر آپ کو داد بھی دی تھی۔ آپ کی شاعری میں علامتی پرندہ شاہین ہے۔ شاہین کے متعلق آپ نے کہا تھا کہ "یہ پرندوں کی دنیا کا درویش ہے۔" آپ نے اپنی شاعری میں شاہین کی علامت قوم میں اور خصوصاً نوجوانوں میں زندگی اور تحریک پیدا کرنے کے لئے استعمال کی۔ آپ کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ہے۔ آپ شاعری کے دوسرے دور میں یورپ میں قیام پذیر تھے۔ دوسرے دور میں آپ نے تقریباً ۲۴ نظمیں لکھیں۔ آپ کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور ۱۹۰۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ شاعری کے تیسرے دور میں آپ نے زیادہ تر فارسی زبان میں شعر کہے۔ آپ کے اردو میں مجموعے بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم ہیں فارسی مجموعے پیامِ مشرق، اسرار رموز، زبورِ عجم اور جاوید نامہ ہیں۔ آپ کا کلام ارمغانِ حجاز وہ واحد کلام ہے جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا مجموعہ ہے۔

آپ کی کتابوں کے تراجم فرانسیسی، انگریزی، بنگالی، عربی، ترکی اور سندھی زبانوں میں کئے جاچکے ہیں۔ آپ کی شاعری سے متاثر ہو کر ایران کے دانشور پروفیسر محمد کاظم شیرازی نے آپ کے بارے میں کہا تھا کہ "کاش! یہ شاعر ایران میں پیدا ہوا ہوتا۔" ۱۹۳۵ء میں آپ مولانا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب کے سلسلے میں پانی پت بھی گئے تھے۔ آپ کی قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ پہلی ملاقات لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ آپ کو "مفکر پاکستان"

کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستان کے قیام' اس کی ترقی و بقاء کے لئے بہت غور کرتے تھے۔ آپ کو جوانوں سے بہت محبت تھی کیونکہ آپ جوانوں کو قوم کا معمار اور ستون سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی شاعری میں نوجوانوں کو بار بار مخاطب کیا ہے۔ آپ کو اسلامی تعلیمات اور حضورؐ سے اتنی شدید محبت تھی کہ جب بھی کہیں حضورؐ کا ذکر مبارک ہوتا تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہوجایا کرتی تھیں۔ حضورؐ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار آپ کسی کے ہاں مہمان ٹھہرے تو میزبان نے خوبصورت پلنگ پر ان کے سونے کا انتظام کیا جب علامہ اقبال نے یہ انتظام دیکھا تو انہیں حضورؐ پاک کا سونا یاد آگیا جو فرش پر دری بچھا کر سادگی سے سویا کرتے تھے' چنانچہ اقبال غسل خانے میں چادر بچھا کر راتیں بسر کرتے رہے۔ آپ نے حضورؐ کو انسان کامل کا معیار قرار دیا ہے۔ ایک دفعہ کلیم احمد شجاع کے سامنے آپ نے کہا تھا کہ "میں یہ سوچ کر اکثر مضطرب اور پریشان ہوجاتا ہوں کہ کہیں میری عمر رسول اللہؐ کی عمر مبارک سے زیادہ نہ ہوجائے۔" آپ اسلامی نظام کے بہت بڑے حامی تھے۔ اس لئے آپ نے کہا تھا کہ "دنیا کے تمام نظام تباہ ہوجائیں گے صرف اسلامی نظام زندہ رہ جائے گا۔" آپ دنیا میں اسلامی نظام کو رائج ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔

علامہ اقبال کو ایک بہت ہی خطرناک درد گردہ کی پرانی بیماری تھی۔ آپ درد گردہ کا علاج حکیم نابینا صاحب دھلوی سے کرایا کرتے تھے۔ آپ کی عمر ابھی دو سال ہی تھی کہ آنکھ میں موتیا آجانے کی وجہ سے آپ کی ایک آنکھ بے کار ہوگئی۔ آپ کی خطرناک علالت کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں عید کے دن سویوں پر گرم دودھ ڈال کر کھانے سے آپ کا گلا بیٹھ گیا اور یہی موذی مرض بالآخر جان لے کر رہا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں آپ شدید بیمار ہوگئے۔ آپ کے چہرے اور پاؤں پر ورم کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔ حکیم محمد حسین قریشی آپ کے معالج ٹھہرے۔ آخری ایام میں آپ کو سانس کے جھٹکے' درد گردہ ایک آنکھ میں موتیے اور ضعف قلب کی تکالیف نے آگھیرا تھا۔ حکیم محمد حسین قریشی نے کہا تھا کہ آپ کو دمۂ قلبی ہے۔ ۲۵ فروری کو آپ کو دمے کا شدید دورہ بھی پڑا تھا۔ آپ کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو "جاوید منزل" میں تقریباً" سوا پانچ بجے صبح بروز جمعرات ہوا تھا۔ آپ کی زبان سے آخری لفظ "اللہ" ادا ہوا تھا۔ سن ھجری کے مطابق آپ کی کل عمر ۶۳ سال

اور سن عیسوی کے مطابق آپ کی کل عمر ۶۱ سال بنتی ہے۔ آپ کا جنازہ بہ راستہ برانڈرتھ روڈ (موجودہ نشتر روڈ) سے ہوتا ہوا دہلی دروازے سے گزر کر بادشاہی مسجد لاہور پہنچا۔ ہجوم کی اس قدر زیادتی تھی کہ کندھا دینا ممکن نہ تھا اس لئے لمبے لمبے بانس چارپائی میں لگادیئے گئے تھے۔ آپ کی نماز جنازہ آٹھ بجے شب ادا کی گئی اور تقریباً" پونے دس بجے رات کو آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کا مقبرہ شاہی مسجد لاہور کے باہر واقع ہے۔ آپ کا باقاعدہ معمول صبح کی نماز اور تلاوت قرآن پاک تھا۔ آپ اس قدر خوش الحان تھے کہ سننے والے مسحور ہوجاتے۔ دل چاہتا کہ آپ یونہی تلاوت کئے جائیں اور آدمی سنتا رہے۔

قرآن پاک کی تلاوت کے دوران آپ پر رقت طاری ہوجاتی اور آپ زار و قطار رونے لگتے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں آپ گرمی کے دنوں میں عموماً" لسی کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ کھانوں میں آپ کباب اور پلاؤ پسند کرتے تھے۔ ترش، چٹ پٹے اور مرغن کھانے آپ کو بہت مرغوب تھے۔ نمک مرچ تیز پسند کرتے تھے۔ شلغم کا اچار بھی بہت شوق سے کھاتے تھے۔ پھلوں میں آپ کو آم اور انگور بہت پسند تھے۔

آپ چائے میں کشمیری چائے نوش کرتے تھے۔ آپ کو آئس کریم بھی بہت پسند تھی۔ جسے آپ میم صاحبہ کی آنسکریم کہا کرتے تھے۔ حقہ بھی استعمال کرتے تھے۔ بچپن میں بٹیر پالنا، کبوتر اڑانا اور اکھاڑے میں ورزش کرنا پسند تھا۔ آپ پورے دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے۔ لباس کے سلسلے میں آپ گرمیوں میں بنیان اور تہ بند استعمال کرتے تھے۔ صرف وکالت کے لئے انگریزی سوٹ پہن کر کورٹ جایا کرتے تھے۔ سردیوں میں آپ کا لباس قمیض، تہ بند اور دھسہ بھی پہنتے تھے۔ جوانی میں انہیں عام پنجابیوں کی طرح شلوار قمیض پسند تھی۔ سر پر سفید یا موتیے رنگ کی ململ کی پگڑی پہنتے تھے۔ بعد میں انہوں نے ترکی ٹوپی بھی پہننا شروع کردی تھی۔

حضرت اقبال نے کل تین شادیاں کیں۔ آپ کی پہلی بیوی کا نام کریم بی بی تھا۔ جن سے دو بچے ایک لڑکا آفتاب اور ایک لڑکی معراج بیگم پیدا ہوئے۔ آپ کی دوسری بیوی کا نام سردار بیگم تھا۔ دوسری بیوی سے بھی دو بچے ایک لڑکا جاوید اقبال اور لڑکی منیرہ بانو پیدا ہوئے۔ تیسری بیوی کا نام مختار بیگم تھا۔ تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔

تو افکارِ اقبال کو عام کردے

محمد علی انصاری

تری یاد سے دل منور رہیں گے
ہمیشہ یہی، لوگ کہتے رہیں گے

تری ذات تھی ایک روشن منارا
کہ تونے ہی ملت کا جذبہ ابھارا

دیا شاعری کو نیا موڑ تو نے
طلسمِ کہن کو دیا توڑ تونے

خودی تیرے اشعار کی خاصیت تھی
بصیرت تری وجہِ روحانیت تھی

ترے عشق کا نور تھا سب کے دل میں
تری فکر سے خوشبوئیں آب و گِل میں

وہ ہستی تری ناز ہے جس پہ سب کو
کیا تونے روشن جہانِ ادب کو

ہوئی تیرے خوابوں کو تعبیر حاصل
ملی ہم کو تیری بصیرت سے منزل

مسلمان آزاد تو ہوگئے ہیں
مگر پھر خرافات میں کھو گئے ہیں

صفات ان میں مومن کی باقی نہیں ہیں
مئے حق پلا دیں جو، ساقی نہیں ہیں

مگر اب بھی اہلِ نظر، تیرے شیدا
جو اپنا جہاں خود ہی کرتے ہیں پیدا

کمندیں ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں
دلوں میں جو ملت کا غم پالتے ہیں

وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے کیا مانگتے ہیں؟
خدا سے یہی اک دعا مانگتے ہیں

کہ عشقِ محمدؐ کو سینوں میں بھردے
تو افکار اقبال کو عام کردے

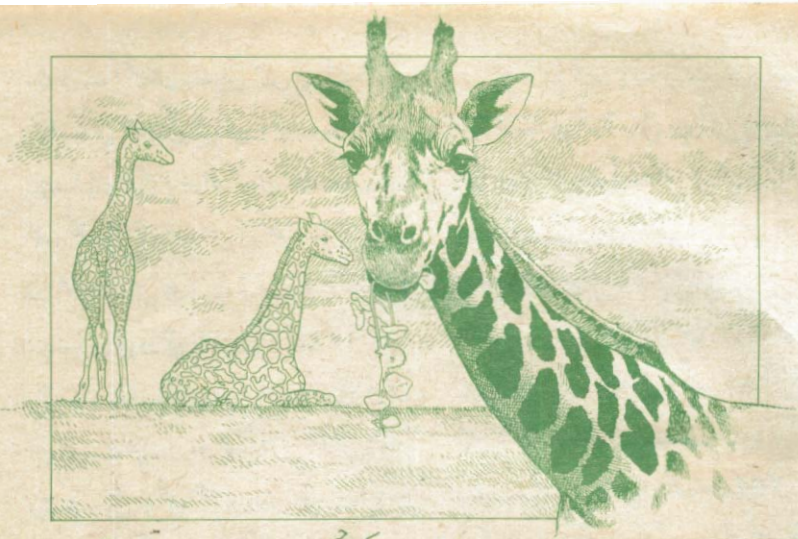

شریف جانور

نیاز محمد، نوح زئی (موسیٰ خیل)

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ اس جانور کا نام بتایئے جس کا بچہ بھی انسان سے بڑا ہوتا ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ مارے حیرت کے سوچتے رہ جائیں گے۔ خیر آئیے ہم آپ کو بتاتے ہی نہیں ملوائے بھی دیتے ہیں افریقہ کے اس عجیب جانور کا نام زرافہ ہے۔

زرافہ کا قد چھ میٹر تک ہوتا ہے۔ اس کا ننھا منا بچہ بھی کوئی ڈیڑھ میٹر کا ہوتا ہے۔ زرافے کے جسم پر بڑے بڑے دھبے ہوتے ہیں۔ اس کے کھر بیل کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ گائے بھینس کی طرح جگالی کرتا ہے۔ اس کے سر پر سینگ بھی ہوتے ہیں لیکن یہ سینگ لڑنے کے لئے نہیں ہیں۔ زرافے کے سینگ تو بس ہاتھی کے دانت ہیں، کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ یہ بھی دکھاوے ہی کے سینگ ہیں۔ وہ ان سے لڑائی میں کوئی مدد نہیں لیتا! اور پھر یہ غریب لڑتا ہی کب ہے؟ یہ تو صلح جو اور امن پسند جانور ہے۔

زرافہ صحرائی اور جنگلی جانوروں کا شریف ترین دوست ہے۔ ہرن اور شتر مرغ بے خوف اس کے پاس آتے جاتے ہیں۔ جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے جانوروں پر شکاریوں اور درندوں کا خوف طاری رہتا ہے۔ وہ بیچارے ڈر

کے مارے اطمینان سے پانی نہیں پی سکتے۔ لیکن زرافے کی موجودگی میں ان کا خوف دور ہوجاتا ہے۔ ایسے موقع پر زرافہ گردن اٹھائے دور دور تک نظر دوڑاتا ہے۔ اس کی نظر بہت تیز ہے۔ ذرا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو سب کو چوکنا کردیتا ہے۔ اس کی دوستی جانوروں کو تحفظ کا احساس دیتی ہے۔ زرافے گروہ بن کر چرنے کو نکلتے ہیں۔ ان میں سے ایک زرافہ چوکیداری کا فرض انجام دیتا ہے۔ باقی ساتھی اطمینان اور تسلی سے اپنا اپنا پیٹ بھرنے لگتے ہیں۔ جب بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے، چوکیدار زرافہ اپنی کنوتیاں کھڑی کرلیتا ہے اور دم ہلاتا ہے۔ بس پھر کیا؟ سارا گروہ چونک اٹھتا ہے۔ سب کے سب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی رفتار ۵۰ کلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

زرافوں کے کھانے کا انداز بھی انوکھا ہے۔ زرافہ گھاس نہیں چرتا بلکہ اونچے اونچے درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں کو نوالہ بناتا ہے۔ کھانا ہی کیا اس کے سونے کا طریقہ بھی سب سے جدا ہے۔ اس کے بچے کبھی زمین پر لوٹ مار لیں تو اور بات ہے، ورنہ جب اسے نیند آتی ہے تو کھڑے کھڑے درختوں کے ساتھ گردن ٹکا کر نیند کے مزے لوٹتا ہے۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ زرافے کو اپنے کھانے کی فکر تو رہتی ہے لیکن پانی پینے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ کبھی مل گیا تو دو چار گھونٹ پی لئے ورنہ موصوف کئی کئی مہینے بغیر پانی کے ہی گزار دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ پانی پینا زرافے کیلئے کسی مصیبت سے کم نہیں۔ پانی پیتے ہوئے وہ اگلی ٹانگیں پھیلا کر، وزن پچھلی ٹانگوں پر ڈال لیتا ہے اور گردن کو جھٹکے دے دے کر رفتہ رفتہ پانی تک منہ کو لاتا ہے۔ کیونکہ اس بے چارے کی گردن نیچے نہیں جھک سکتی۔ بیس بیس منٹ اسی مشقت میں گزر جاتے ہیں۔ دو چار گھونٹ لینے کے بعد ایک جھٹکے سے گردن واپس لاتا ہے اور سیدھا کھڑا ہوکر دم لیتا ہے۔

دوستو! آپ اگر چڑیا گھر جائیں تو وہاں زرافے سے ضرور ملاقات کریں آپ جلد ہی اس کے دوست بن جائیں گے۔ ہوسکے تو اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی لے جائیں۔ زرافہ بڑی محبت اور گرم جوشی سے آپ کا تحفہ وصول کرے گا اور محبت بھری خاموش نظروں سے آپ کا شکریہ ادا کرے گا۔ امن پسندی، محبت اور صلح جوئی زرافے کی زندگی کے اصول ہیں۔ وہ دوست سب کا ہے دشمن کسی کا نہیں۔

اسمِ اعظم

احسان الحق حقانی

شکیل کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک بچپن والی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا۔ والدین کا بڑا بیٹا تھا۔ اس لئے اس کے ابو اور امی اس کی حرکتوں سے بہت پریشان تھے۔ لکھنے پڑھنے سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اپنے دوستوں سے بڑے فخریہ انداز میں کہا کرتا تھا کہ "ابو نے مجھے الٹا لٹکایا مگر میں ایک ہی بات کہتا رہا کہ مرجاؤں گا لیکن اسکول نہیں جاؤں گا۔" اس کے ابو بھی اسے سمجھا سمجھا کر، مار پیٹ کر بھی تھک چکے تھے۔ اور اب تو وہ اسے کسی قسم کی نصیحت بھی نہیں کرتے تھے۔ اڑوس پڑوس سے جب کوئی بی اماں، کوئی بڑے میاں، کوئی بچہ یا اسکول کا مالی شکیل کی شکایت کرتا تو شکیل کے ابو امی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شکیل کو کس طرح سمجھائیں، اسے یہ احساس کیسے دلائیں کہ وہ اب

بچہ نہیں ہے' جوان ہے اور اس کے فراخ پیشانی' کشادہ سینے اور مضبوط بازوؤں کو ان کے بڑھاپے کا سہارا ہونا چاہئے۔

شکیل کو اپنے امی اور ابو کے دکھ کا ذرہ برابر احساس نہیں تھا۔ دل میں تو وہ خیال کرتا تھا اور دوستوں سے بھی کہتا تھا کہ میں امی ابو کا بہت خیال رکھتا ہوں اور مجھے ان سے بہت محبت ہے لیکن اس نے عملی طور پر اس محبت کا کبھی کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تھا۔ وہ ہر وقت نامعقول قسم کے خیالات میں ڈوبا رہتا۔ وہ اکثر سوچتا کہ "اگر مجھے الہ دین کا چراغ مل جائے تو میں ابا جان کو ملازمت ترک کرنے پر مجبور کردوں گا۔ اور دنیا جہان کی نعمتیں ان کے قدموں میں ڈھیر کردوں گا۔" الہ دین کے چراغ کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کباڑیوں کے سارے بازار چھان مارے تھے۔ خود اس کے کمرے میں مختلف ڈیزائنوں کے رنگ برنگے چراغوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی دن کوئی چراغ اچانک ہی گڑگڑاہٹ کی آواز نکال کر کسی جن کو برآمد کردے گا۔ اور اس کی قسمت کے سب اندھیرے دور ہوجائیں گے۔ مہربان بزرگوں نے' اچھے دوستوں نے اسے لاکھ سمجھایا مگر اس کے دماغ سے الہ دین کا چراغ نکلتا ہی نہیں تھا۔ چراغ' جن' دولت' طاقت اس کی ہر گفتگو ان ہی چیزوں پر گھومتی تھی۔ خیر خدا خدا کرکے اس کی گفتگو سے الہ دین کا چراغ تو نکلا۔ لیکن اب ایک نیا نام اس کے ہونٹوں پر تھا اور وہ تھا "اسم اعظم"۔

اسم اعظم کے بارے میں ایک لمبی چوڑی کہانی سن کر اس کے خیالات کو ایک نیا رخ مل گیا۔ شکیل کو پختہ یقین تھا کہ اسم اعظم اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا مقدس اور خفیہ نام ہے جو گنتی کے چند بزرگوں کو معلوم ہے اور اگر اس نے اسے سیکھ لیا تو وہ اس سے الہ دین کے چراغ سے بھی زیادہ کام لے سکے گا۔ پھر کیا تھا' اب وہ ہر وقت اسم اعظم کے بارے میں سوچتا رہتا۔ پہلے وہ چراغ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا' اب وہ گھنٹوں اسم اعظم کی سوچ میں گم رہتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شکیل گاؤں کی آبادی سے دور سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ ان کے محلے کے امام مسجد کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے شکیل کو اتنے فلسفیانہ انداز میں بیٹھے دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکے اور بالآخر شکیل نے انہیں بتا ہی دیا کہ اسم اعظم حاصل کرنے کی کوششوں میں سرگرداں ہوں۔ مولوی صاحب پہلے تو بہت حیران ہوئے۔ لیکن جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ آخر اسی محلے میں رہتے تھے انہوں نے مسکرا کر کہا "بھئی

صرف اتنی سی بات کے لئے تم اتنے پریشان ہو۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں اب تک تمہیں اسم اعظم سکھا بھی چکا ہوتا۔"

"جی" شکیل کے منہ سے ایک طویل جی نکل گیا۔ "آپ .... یعنی کہ آپ کو اسم اعظم معلوم ہے؟" اس نے انتہائی حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی۔ مجھے معلوم ہے اور میں نے آج تک جتنے لوگوں کو سکھایا ہے۔ وہ بھی مزے لوٹ رہے ہیں۔" شکیل کا منہ مارے حیرت کے عجیب سا زاویہ پیش کررہا تھا۔ وہ فوراً" مولوی صاحب کی منتیں کرنے لگا کہ "مجھے بھی اسم اعظم سکھائیے" کیونکہ شکیل کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے اور یوں شکیل کی پہلی ہی عملی جدوجہد کام آگئی اور مولوی صاحب نے حامی بھرلی لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "کام ذرا محنت طلب ہے۔ تمہیں زیادہ تر وقت اسم اعظم سیکھنے میں ہی صرف کرنا ہوگا۔ اور شاید اس سے زیادہ تر تکلیف.....!"

"میں ہر زحمت اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔" شکیل نے ان کی بات کاٹتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"پہلے بات تو سنو۔" مولوی صاحب نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "اس کے لئے سب سے پہلی تکلیف تمہیں نماز کی اٹھانا پڑے گی اور تمہیں پانچ وقت نماز کے لئے مسجد آنا پڑے گا...."

"منظور ہے!" شکیل نے پھر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور سنو" مولوی صاحب نے کہا۔ "یہ سب کچھ تمہاری محنت اور قابلیت پر منحصر ہے کہ تم اسم اعظم ایک مہینے میں سیکھتے ہو یا دو تین سالوں میں۔!"

"میں؟ میں اسے دو منٹ میں سیکھ لوں گا۔" شکیل نے جذبات کی شدت سے کہا۔

"بھئی اطمینان سے بات سنو اور ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرو۔ کیونکہ تم تو ہو کورے ان پڑھ اور اسم اعظم کے حصول کے لئے کم سے کم لکھنا' پڑھنا تو ضرور سیکھنا پڑے گا۔"

یہ شرط ذرا مشکل تھی اور عام حالات میں شکیل شاید اسے ناممکن سمجھتا۔ لیکن اسم اعظم سیکھنے کے لئے وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھا اور یوں پہلی ہی ملاقات میں شکیل نے مولوی صاحب کے ساتھ وقت طے کرکے پڑھنا شروع کردیا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ شکیل کے امی اور ابو بہت خوش تھے کہ اب ان پڑھ شکیل کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوا کرتی تھی۔ اور وہ انتہائی جذبے اور

شوق سے ہر سبق کو یاد کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ مایوس بھی ہو جاتا کہ اتنے دن گزر گئے اور مولوی صاحب اسے اسم اعظم کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے ہیں۔لیکن اس نے محنت اور رفتار میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ اس کی محنت اور مولوی صاحب کی محبت رنگ لا رہی تھی ایک ہی سال میں شکیل نہ صرف لکھنے پڑھنے' جمع' تفریق اور تقسیم میں ماہر ہو گیا بلکہ اب دسویں جماعت کی انگریزی کی کتاب میں بھی شدبد پیدا کر چکا تھا۔ مولوی صاحب کے کہنے پر شکیل کے ابو نے میٹرک کے امتحان کے لئے شکیل کا فارم پرائیویٹ طور پر بھیج دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد اُن پڑھ اور نافرمان شکیل ایک میٹرک پاس پڑھا لکھا وجوان بن چکا تھا۔اس کی عادات میں بڑی بڑی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اب اس کا سب سے ترین دوست کتاب تھی جس سے اسے والدین کے احترام اور نیک بننے اور نیکی پھیلانے کے ریقے پتہ چلے تھے وہ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کا ل نوجوان بن گیا تھا۔ پھر اسے ایک پرائیوٹ رم میں نوکری مل گئی۔ اس دن اس کے ابو بہت ش تھے اور ماں کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی ں تھا۔

اسی دن نمازِ مغرب کے بعد مولوی صاحب نے بھی شکیل کو بٹھا کر اسے مبارک باد دی اور کہا کہ آج وہ اس سے اسم اعظم کی بات بھی کریں گے۔ شکیل کا دل بڑی زور سے دھڑکا اس کی برسوں کی خواہش کو آج زبان ملنے والی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش تھا۔ مولوی صاحب نے دھیمی آواز سے کہنا شروع کیا "تم محنت اور عمل کی دنیا میں آچکے ہو اور جو لوگ محنت کرتے ہیں وہ کسی اسم اعظم اور چراغِ الہ دین کے محتاج نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ کے سبھی نام عظیم ہیں۔ اور تم اللہ تعالیٰ کے سبھی نام جان چکے ہو اور اس کی رحمتوں کا مشاہدہ کر چکے ہو وہ سب سے بڑا نام جسے اسم اعظم کہا جاتا ہے اور جسے تم سیکھ بھی چکے ہو' جانتے ہو وہ سب سے بڑا نام کیا ہے؟ جو دریا کی روانی روک سکتا ہے اور جو الہ دین کے چراغ سے زیادہ کار آمد ہے۔ وہ عظیم نام "علم" ہے۔"

"ہیں....." شکیل ایک لمبی سی "ہیں" کر کے اچھل پڑا۔ مارے حیرت کے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے مسکرا کر دیکھا پھر اسی روانی سے بولے "شکیل بیٹا! علم ہی وہ اسم اعظم ہے' جس نے انسان کو سمندر کی تہہ دکھاوی اور آسمان کی بلندیاں بھی۔ جس نے پہاڑوں کا سینہ چیر دیا اور زمین کے خزانے نکال

لئے۔ دنیا میں جتنی سہولتیں تم دیکھ رہے ہو۔ وہ اسی اسم اعظم ہی کا کمال تو ہے۔ تم نے تو ابھی تک اس اسم اعظم کے صرف چند حروف ہی سیکھے ہیں۔ کامیابی کا راز یہی ہے کہ باقی ساری زندگی اسی اسم اعظم کے حصول میں لگادو۔"

مولوی صاحب شاید مزید بھی کچھ کہتے لیکن عشاء کی اذان ہو چکی تھی اور لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ وہ دونوں بھی خدائے علیم و خبیر کے حضور سر جھکانے چل پڑے۔ نماز ہوئی، دعا کے لئے سب کے ہاتھ بلند ہوئے۔ مولوی صاحب نے دعا مانگی۔ "اے اللہ ہمارے علم میں اضافہ فرما۔" "آمین" کہنے والوں میں سب سے بلند اور پرجوش آواز شکیل کی تھی۔

ماں

مرسلہ

طیبہ صدف، رحیم یار خاں

ابا جی مجھے مارتے تھے تو امی بچالیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں تو ابا جان کیا کریں گے؟ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا ہوتا ہے میں نے امی کا کہنا نہ مانا۔ انہوں نے کہا بازار سے دہی لا دو۔ میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا۔ میں نے اصرار نہ کیا۔ انہوں نے کہا پیڑھی پر بیٹھ کر روٹی کھاؤ، میں نے زمین پر دری بچھا دی اور اس پر بیٹھ گیا اور کپڑے بھی میلے کر دیئے۔ میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ امی ضرور ماریں گی۔ مگر انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ "کیوں پتر دلور! میں صدقے بیمار تو نہیں ہے تو؟" اس وقت میرے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ تھے۔

(میرزا ادیب)

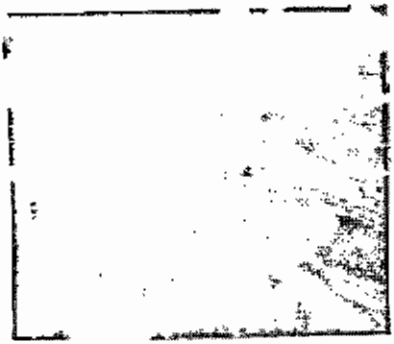

1000 قبل مسیح میں قرطاجنہ (کارتھیج) کے فنیقی تاجر بحری راستے کے ذریعے سفر کرتے ہوئے بحیرہ روم کے شمالی ساحل پر اترے۔ اور یہاں "اُوپا" کے نام کا ایک نیا شہر بسایا جو رفتہ رفتہ ایک بڑا تجارتی مرکز بن گیا۔ اوپا سے 120 کلو میٹر مشرق میں "ہپس" اور مغرب میں 67 کلو میٹر کے فاصلہ پر "صبراتہ" واقع تھا۔ یہ دونوں شہر بھی ان دنوں تجارت کے اہم مراکز میں شمار ہوتے تھے۔ یونانیوں نے انہیں "تریپولیس" کا مشترکہ نام دیا۔ یونانی زبان میں اس لفظ کے معنی ہیں "تین شہر! ....." یہی تریپولیس بعد میں..... طرابلس مشہور ہوا۔

268 ق م میں فنیقیوں اور رومیوں کے درمیان پہلی جنگ شروع ہوئی اور پھر وقفے وقفے سے دونوں فریقوں کے مابین کئی خونریز معرکے ہوئے ..... بالآخر 146 ق م میں اہل قرطاجنہ کو رومیوں نے زبردست جنگ کے نتیجے میں حتمی شکست سے دوچار کردیا اور طرابلس پر موجودہ الجزائر کے حاکم اور رومیوں کے حلیف نومیڈیا نے قبضہ کرلیا۔ 46 ق م میں رومی سپہ سالار جولئیس سیزر نے طرابلس کو تسخیر کیا اور باقاعدہ طور پر سلطنت روما کا حصہ بنادیا۔ رومی عہد حکومت میں

طرابلس نے قابل ذکر ترقی کی۔ خصوصاً" شہنشاہ سپٹمیئس (جو بتس شہر کا باشندہ تھا) نے اس علاقے کو ہر لحاظ سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچادیا۔ 429ء میں وینڈل قوم نے شمالی افریقہ پر حملہ کردیا اور ایک طویل جنگ کے بعد 455ء میں طرابلس پر دسترس حاصل کرلی۔ ان کے سوسالہ دور کا خاتمہ بزنطینیوں نے کیا......

سنہ 644ء میں والیٔ مصر حضرت عبداللہ بن ابی سرح نے طرابلس پر لشکر کشی کی یہاں غیر مسلم بربر حاکم جرجید 120000 فوج کے ساتھ مقابلہ پر اتر آیا۔حق و باطل کی یہ جنگ ایک عرصہ تک جاری رہی۔لیکن فیصلہ نہ ہوسکا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو تازہ دم فوج دے کر بھیجا۔ آپؓ نے پے درپے حملے کرکے اہل طرابلس کو زچ کرڈالا۔۔۔ تھک ہار کر جرجید نے 25000 درہم سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے صلح کرلی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بربر قبائل کی طرف سے بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔جن کی سرکوبی کے لئے اسلامی لشکر دوبارہ شمالی افریقہ پہنچ گیا۔ مقابلوں کے دوران مسلمانوں نے کافی جانی اور مالی نقصان اٹھایا۔

بنو امیہ کے دور خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ نے شمالی افریقہ کی اسلامی مقبوضات کے حاکم حضرت عقبہ بن نافع کو بربروں کی سرکوبی کا حکم دیا۔آپ نے طرابلس کو فتح کرنے کے بعد باغیوں کو متواتر شکستیں دے کران کی طبیعت "درست" کردی۔ یوں طرابلس باضابطہ طور پر سلطنت اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔بعد ازاں کئی بربر قبائل نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوکراسلام قبول کرلیا۔

سنہ 749ء میں یہ شہر خلافت بنو عباس (بغداد) کی قلمرو میں شامل ہوا۔800 سے 909ء تک یہاں اغلبی برسراقتدار رہے۔ اگلے 181 برس تک مختلف اقوام اور مذاہب کے لوگ اس پر حملہ آور ہوئے اور قابض رہے۔

1090ء میں بربروں کے ایک خاندان مرابطین نے یہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ 1146ء میں صقلیہ (سسلی) نارمن بادشاہ طرابلس پر تسلط جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ اگلے سال 1147ء میں ایک بربر قبیلہ موّحدین نے اندلس (ہسپانیہ) فتح کرلیا اور 1157ء میں نارمنوں کو شکست فاش دے کر طرابلس سے مار بھگایا ...... موحدین کی حکومت 1259ء تک برقرار رہی ...... 1510ء میں ہسپانیہ کے عیسائی حکمران فرڈیننڈ نے طرابلس کو ہڑپ کرلیا۔لیکن وہ اسے ہضم

کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے اور کچھ ہی عرصہ بعد مقامی عربوں نے انہیں سرنگوں کرتے ہوئے لیبیا پر اپنا اقتدار بحال کرلیا ـــ سنہ 1551ء میں عثمانی ترکوں نے امیرالبحر سنان پاشا کی قیادت میں طرابلس کو فتح کرکے سلطنت عثمانیہ (ترکی) کا حصہ بنادیا۔ ان دنوں ترکی پر سلیمان عالیشان کی حکومت تھی۔

1711ء میں ایک مقامی ترک فوجی افسر احمد پاشا قرمانلی نے یہاں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ 1835ء تک اس کے جانشین طرابلس پر حکومت کرتے رہے۔ ان دنوں یہ شہر دنیا کے اہم اقتصادی اور تجارتی مراکز میں شمار ہوتا تھا اور یہاں کی مصنوعات سمندری راستوں کے ذریعے ایشیا' یورپ اور ہمسایہ افریقی ممالک تک جاتی تھیں۔ آلِ قرمانلی کے زوال کے بعد یہ شہر دوبارہ سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوگیا۔ 26 ستمبر 1911ء کو ترکی اور اٹلی کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ جس کے نتیجے میں 5 اکتوبر کو طرابلس سمیت لیبیا کے تمام اہم شہروں پر اطالوی قابض ہوگئے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب اٹلی نے شکست کھائی تو طرابلس (لیبیا) اقوام متحدہ کی زیر نگرانی آگیا..... 21 نومبر 1949ء کو اقوام متحدہ نے لیبیا کو آزاد کرنے کے متعلق قرارداد منظور کی..... بالآخر 24 دسمبر 1951ء کو غلامی کی زنجیریں زمین بوس ہوئیں اور لیبیا ایک آزاد اسلامی مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔ سردار محمد ادریس السنوسی کو اس کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن ان کی غلط پالیسیوں کے باعث ملک اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے کمزور ہونے لگا۔ کیونکہ شاہ ادریس نے 1954ء میں امریکہ کو اپنے ملک میں فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی ـــ یکم ستمبر 1969ء کو کرنل معمرالقذافی اور ان کے ہم خیال فوجی افسران نے مل کر شاہ ادریس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ بحیثیت وزیراعظم اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد قذافی نے تمام امریکی فوجی اڈوں پر قبضہ کرلیا۔ امریکہ "افریقی شیر" کی جرأت مندی کے جواب میں تلملا کر رہ گیا..... 1974ء میں قذافی لیبیا کے صدر منتخب ہوگئے۔ اور 1975ء میں آپ کی

آئیڈیالوجی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے 618 اراکین پر مشتمل جنرل نیشنل کانگریس تشکیل دی گئی۔ اور یوں لیبیا میں ایک منفرد حکومت کا آغاز ہوا۔ جس کے تحت تمام اختیارات عوام کو دے دیئے گئے کیونکہ وہی ملک کی اصل طاقت اور اپنی سرحدوں کے مؤثر پاسدار تھے۔ آپ یہ سن کر یقیناً" حیران ہوں گے کہ لیبیا میں سفیروں تک کا انتخاب بھی عوام کو حاصل ہے۔ سیاسی نظام کا منبع قذافی کی مشہور زمانہ کتاب "دی گرین بک" ہے۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔

آیئے اب طرابلس چلتے ہیں!!!

ہنگامہ خیز ماضی کا حامل یہ شہر دل پذیر' عرب جمہوریہ لیبیا کا دارالحکومت ہے۔ اس کی آبادی تقریباً" 1226000 نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں 98 فیصد مسلمان اور بقیہ دو فیصد لوگ یہودی اور عیسائی ہیں۔ جبکہ بربر قبائل کا تناسب 24 فیصد ہے۔ جو زمانہ قدیم سے یہاں آباد چلے آرہے ہیں۔ مجموعی آبادی کا 58 فیصد شہر اور 42 فیصد دیہات میں مقیم ہے۔ سرکاری مذہب اسلام اور قومی زبان عربی ہے۔ دیگر زبانوں میں اطالوی' انگریزی اور فرانسیسی شامل ہیں۔ سکہ لیبئن دینار کہلاتا ہے اور قومی ترانہ کا عنوان ہے "اللہ اکبر"

طرابلس کا شمار لیبیا کے اہم تعلیمی' صنعتی' اقتصادی و تجارتی اور مواصلاتی مراکز میں ہوتا ہے۔

شعبہ تعلیم کی ترقی کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہاں کے 100 فیصد بچے اسکول جاتے ہیں۔ (جن کا مجموعی تناسب 27 فیصد بنتا ہے) 67 فیصد ثانوی اور 6 فیصد اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اسکول کے ہر 19 بچوں کے لئے ایک استاد موجود ہے۔ خواندگی کی شرح 58 فیصد سے بڑھ کر 89 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ اسکول اور کالجوں کے علاوہ یہاں ٹیکنیکل' نرسنگ' شریعت اور دست کاری کی کئی تربیت گاہیں قائم کی گئی ہیں اور ایک یونیورسٹی بھی موجود ہے۔ 1959ء میں تیل کی دریافت کے بعد سے طرابلس نے صنعتی میدان میں قابل قدر ترقی کی ہے۔ اس وقت یہاں تیل صاف کرنے کے متعدد کارخانے کام کررہے ہیں۔ دیگر صنعتوں میں غذائی اشیاء کی تیاری' اونی' ریشمی اور سوتی کپڑا' کیمیائی کھاد اور دست کاری اہم ہیں۔

اہم زرعی اجناس میں گندم' جو' لوبیا' زیتون' کھجور' مختلف اقسام کے انگور' مالٹے' بادام' تمباکو اور ترش پھل شامل ہیں۔

شہریوں کے علاج معالجہ کے لئے کئی چھوٹے

ہسپتالوں کے علاوہ 1985ء کے بعد دو بڑے ہسپتال بھی قائم کئے گئے ہیں جو جدید طبی سہولتوں سے آراستہ ہیں۔ ہر شہری کو مفت علاج کی سہولت حاصل ہے۔

کشادہ اور تیز رفتار شاہراؤں کے ذریعے طرابلس کو ملکی شہروں اور دیہاتوں سے ملادیا گیا ہے۔ ریلوے نظام کے تحت یہ ہمسایہ شہروں کے علاوہ اسلامی ملک تیونس کے ایک شہر سفاقس سے بھی مربوط ہے۔ طرابلس کا بین الاقوامی ایئر پورٹ شہر سے تیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نیز طرابلس کی اپنی بندرگاہ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی ہیں۔

طرابلس کے مرکز میں واقع تجارتی علاقہ بہت دلفریب ہے۔ یہاں سڑکوں کے ساتھ ساتھ دونوں اطراف میں درخت لگائے گئے ہیں اور ہر چوراہے پر چھت دار (اوورہیڈ) راستہ بنایا گیا ہے۔

تاریخی سوق (بازار) شہر کا سب سے دلچسپ حصہ ہے۔ پرانی بندرگاہ کے قریب اس پر پیچ بازار کو وسعت دینے کی غرض سے سمندر کو پاٹ کر مزید زمین حاصل کی گئی ہے۔ یہاں آپ رومی عہد کی کئی یادگاریں دیکھ سکتے ہیں۔ سوق کی "اَلناقہ مسجد" کا شمار شمالی افریقہ کی قدیم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب عربوں نے اس قصبہ پر قبضہ کیا تو مقامی لوگوں نے ایک کثیر رقم جمع کی اور اونٹنی پر لاد کر حضرت عمرو بن العاص کے پاس لے گئے تاکہ وہ انہیں معاف کردیں۔ لیکن آپؓ نے ان کی پیشکش مسترد کرتے ہوئے اس رقم سے سوق میں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ 11-1610ء کے دوران مسجد کو وسیع کرکے جامع مسجد کا درجہ دیا گیا اور چھت پر اینٹوں کی مدد سے 42 گنبد تعمیر کئے گئے۔

طرابلس شہر کی سب سے بڑی اور تاریخی عمارت قلعہ ہے جسے آج کل "سرخ محل" کہا جاتا ہے۔ اس دفاعی حصار نے شہر کی تلاطم خیز تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرمانلی فرماں رواؤں نے اپنے دور حکومت میں قلعہ کے اندر کئی اور خوبصورت اور دیدہ زیب محل تعمیر کرائے تھے۔ 1736ء میں احمد پاشا قرمانلی نے قلعہ کے ساتھ ایک شاندار جامع مسجد بنوائی تھی۔ نیز ایک دینی درس گاہ بھی قائم کی تھی۔ "جامع احمد پاشا" ترک فن تعمیر کا ایک حسین شاہکار ہے۔ مسجد کے مرکزی ہال میں سنگ مرمر کے 16 ستون ہیں جنہوں نے مسجد کی گنبد نما چھت کو سہارا دے رکھا ہے۔ اندرونی دیواروں پر چمکدار منقش ٹائلیں لگائی گئی ہیں اور چھت پر

خوبصورت پچ کاری کی گئی ہے۔ طرابلس کے بڑے گرجا گھر کو پاک و صاف کرکے مسجد میں تبدیل کردیا گیا ہے اور اس کو "جامع مسجد جمال عبدالناصر" کہا جاتا ہے۔ مسجد شریف بھی شہر کی بڑی مسجدوں میں شمار ہوتی ہے۔

حکومت نے طرابلس کے ثقافتی اہمیت کے مقامات کو بحال کرکے اس شہر کی کشش میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ اب یہاں سیاحوں کے ذوق طبع کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔ یونیسکو کے تعاون سے قلعہ کے اندر ایک وسیع و عریض عجائب گھر قائم کیا گیا ہے۔ جس میں موجود نوادرات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ●

پرچم

یا سر ملک ڈڈیال، آزاد کشمیر

۱۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پرچم کا نام عقاب تھا۔

۲۔ قائداعظم نے پاکستان کے پرچم کے لئے پانچ ستاروں کی تجویز پیش کی تھی۔

۳۔ امریکی پرچم ۱۷۷۷ء میں منظور ہوا۔

۴۔ برازیل کے پرچم پر گلوب اور برازیل کا موٹو بنا ہوا ہے۔

۵۔ فرانس کا پرچم (Tri colour) کہلاتا ہے اور یہ تین رنگوں سرخ، سفید اور نیلے پر مشتمل ہے۔

۶۔ اب تک سب سے زیادہ تبدیلیاں ترکی کے پرچم میں ہوئی ہیں۔

۷۔ مالٹا کے پرچم پر جارج کراس بنا ہوا ہے۔

۸۔ مصر کے پرچم میں ایک ستارے کا اضافہ کرنے سے شام کا اور ایک ستارہ کم کرنے سے یمن کا پرچم بن جاتا ہے۔

۹۔ دنیا کا قدیم پرچم ڈنمارک کا ہے اور اس کا نام (Baneburg) ہے۔

چھالیہ

ایم اعجاز احمد

پان چھالیہ ہمارے معاشرے میں رچ بس چکے ہیں اور اب تو انہیں ہم اپنی روایات کا ایک حصہ سمجھنے لگے ہیں۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو کھانے کے بعد ہم پان چھالیہ ہی پیش کرتے ہیں۔ اسکول اور کالجوں کے طلباء بازاروں میں ملنے والی میٹھی چھالیہ کے دل دادہ ہوتے ہیں۔

چھالیہ یا سپاری اصل میں پودے کی ایک شکل ہے۔ جسے نباتاتی اصطلاح میں "آریکا" کہتے ہیں۔ یہ سری لنکا، بنگلہ دیش اور انڈیا میں وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی ہے۔ کراچی میں سپاری سے دو طرح کی پھپھوند دریافت کی گئی ہیں جن کا نام "اسپروجلس" اور "فالیس" ہے۔ پہلی قسم کالے رنگ کی جبکہ دوسری کتھئی اور زردی مائل کی ہوتی ہے۔ یہی قسم بہت زیادہ خطرناک بھی ہے کیونکہ یہ ایک زہریلا مادہ بناتی ہے۔ یہ خطرناک پھپھوند جگر کے سرطان کی ذمہ دار ہے اور منہ کا سرطان بھی اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آیئے ایک سرسری جائزہ لیں کہ چھالیہ کھانے والوں میں کیا کیا ممکنہ بیماریاں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ سانس لینے میں دشواری اور اگر کھاتے کھاتے پھیپھڑوں کے خلیات میں چلی جائے تو یقینی موت۔

۲۔ جبڑوں کے جوڑوں میں درد نمودار ہوجاتا ہے۔

۳۔ کان کے درد کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ دانت حساس ہوجاتے ہیں۔

۵۔ منہ کے اندر کی جلد ختم ہونے لگتی ہے۔

۶۔ پاکستان میں کینسر کے امراض کے شکار میں ۲۰ فیصد منہ کے کینسر کے مریض ہیں اس موذی مرض کی زیادہ ذمہ دار چھالیہ ہی ہے۔ ●

قلم دوست

روشنی

عقیل شاہ عیشی، پنجگور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاءؑ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیینؐ ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لئے کوئی نبی آئے)

(بخاری)

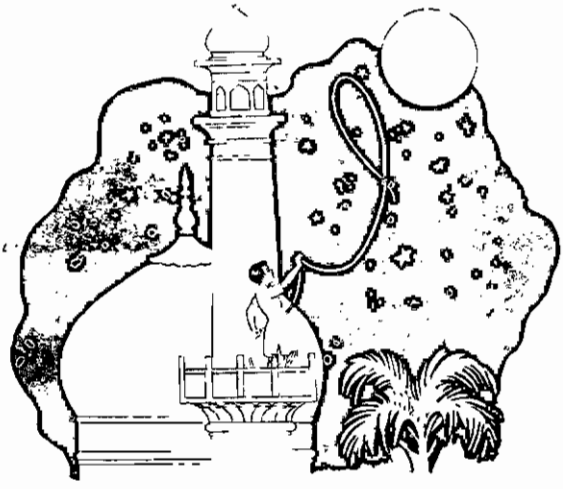

رحمتِ عالمؐ

قائدؐ سب کے

صمد عمران مغل، چکوال

دعوت دیں کو عام کروں گا
اچھے اچھے کام کروں گا

اب نہ رہے گا کوئی تعصب
بھائی چارہ عام کروں گا

ظلم کا رستہ میں روکوں گا
ہمدردی کو عام کروں گا

مٹ جائے گی ساری برائی
نیکی صبح و شام کروں گا

سوہنی دھرتی پاک وطن میں
نافذ میں اسلام کروں گا

نیک بنو، پھیلاؤ نیکی
میں یہ نعرہ عام کروں گا

کرنے تھے جو کام بڑوں کو
میں وہ سارے کام کروں گا

پاکستان ہے اپنی جنت
روشن اس کا نام کروں گا

اپنا آئیں ، قرآن و سنت
اس کے مطابق کام کروں گا

رحمت عالمؐ قائد سب کے
ان کی باتیں عام کروں گا

انوکھی شرطیں

وقاص نفیر الدین انصاری

بہت سال پہلے کی بات ہے کہ ملک جاپان میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام چیکو تھا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں جڑواں تھیں مگر ان کی ماں مرچکی تھی۔ بے چارا باپ اکیلے ہی دونوں ننھی منی جانوں کو پالتا رہا۔ وہ اپنی لڑکیوں سے بہت محبت کرتا تھا دن گزرتے رہے لڑکیاں بڑی ہوگئیں۔ چیکو نے سوچا کہ اپنی بیٹیوں کا امتحان لیا جائے اس کو ایک ترکیب سوجھی اس نے اپنی بیٹیوں کو بلا کر کہا میں تم دونوں میں سے اپنی ساری جائیداد اس کو دوں گا جو ذہین لڑکی میری شرط کو پورا کرے گی۔ اس نے بڑی بیٹی یوکی سے کہا کہ تمہیں ایک کاغذ میں آگ لانا پڑے گی پھر اس نے اپنی چھوٹی بیٹی چی پو سے کہ کہ ایک کاغذ میں ہوا کے جھونکیں لانے پڑیں گے۔ ورنہ تم واپس نہ آنا۔

دونوں لڑکیوں نے شرطیں سن کر جانے کی اجازت مانگی۔ لیکن دونوں پریشان تھیں کہ یہ انوکھی شرطیں کیسے پوری کریں گے۔ یہ سوچ کر

خوب سے خوب تر

حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں۔

☆ امیروں کی تواضع خوب ہے اور غریبوں کی خوب ہے۔

☆ توبہ بوڑھے سے خوب ہے اور جوان سے خوب ہے۔

☆ سخاوت مال دار سے خوب ہے اور مفلس سے خوب ہے۔

مرسلہ ... عدنان فیصل

گاؤں کے ایک بوڑھے عقل مند آدمی کے
س گئیں اور اس سے مشورہ مانگا۔ اس نے
جب سے کہا کہ کاغذ میں آگ لے جانے کی اس
نے بات کبھی نہ سنی اِسی طرح ہوا کے جھونکوں
لا کاغذ بھی کہیں نہیں ہوتا۔ غرض ہر طرف
سے مایوس ہو کر وہ آگے بڑھیں اور جنگل کی
رف نکل گئیں۔

جنگل میں انہیں کچھ عجیب سے درخت نظر
ئے اِتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی
خت کے پیچھے سے نکلا اور کہا کہ" تم کون ہو اور
ں کیا کر رہی ہو؟ یہ علاقہ میرا ہے اور درخت
ے"اس کی ڈراؤنی شکل دیکھ کر چی پو ڈر کر
نے لگی۔ وہ آدمی نرم پڑ گیا اس نے کہا"نہ رو
رے آنسو کے نمکین پانی سے پیڑ مرجائیں
"

اس نے آنے کا سبب پوچھا۔ دونوں نے
سارا قصہ سنایا بوڑھا بولا۔ "یہ تو کوئی مشکل کام
نہیں۔ ایسا کاغذ تو آسانی سے مل سکتا ہے۔" یہ
سنتے ہی دونوں خوش ہو گئیں۔

بوڑھے نے کہا "کہ دیکھو یہ رہا وہ کاغذ اس
کا یہ کہنا تھا کہ ایک رنگین کاغذ کا بڑا سا ٹکڑا لہراتا
ہوا نیچے آگرا۔ بوڑھے نے اسے اٹھایا اور کہا
"اس کاغذ سے تم دونوں کا کام ہو جائے گا۔ اصل
میں ہوا تو تمہارے چاروں طرف بھری ہوئی
ہے۔ اب اس کے لئے جھونکوں کی ضرورت
ہے۔" چی پو نے کہا "اس کاغذ کے ٹکڑے سے
ہوا کیسے لے جاسکتے ہیں؟" بوڑھے نے درخت کی
چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں توڑ کر برابر برابر اس کاغذ پر
چپکا دیں پھر اس نے اپنی انگلیوں کی مدد سے اس
کاغذ کو تہہ کیا اور کہا "یہ تمہارا پنکھا تیار ہو گیا۔"

پھر اس نے یوکی کے لئے رنگین کاغذ اور
ٹہنیاں لیں اِنہیں موڑ کر گول جیسی چیز بنا دی اور
کہا۔"یہ تمہاری قندیل۔" یہ کہہ کر موم بتی جیب
سے نکال کر قندیل کے اندر لگا دی۔ "اور اب
اس کاغذ میں تم آگ لے جاسکتی ہو۔" اس طرح
دونوں بہنوں نے اپنے باپ کی شرطیں پوری
کر کے اسے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا۔ باپ ان
سے بہت خوش ہوا۔

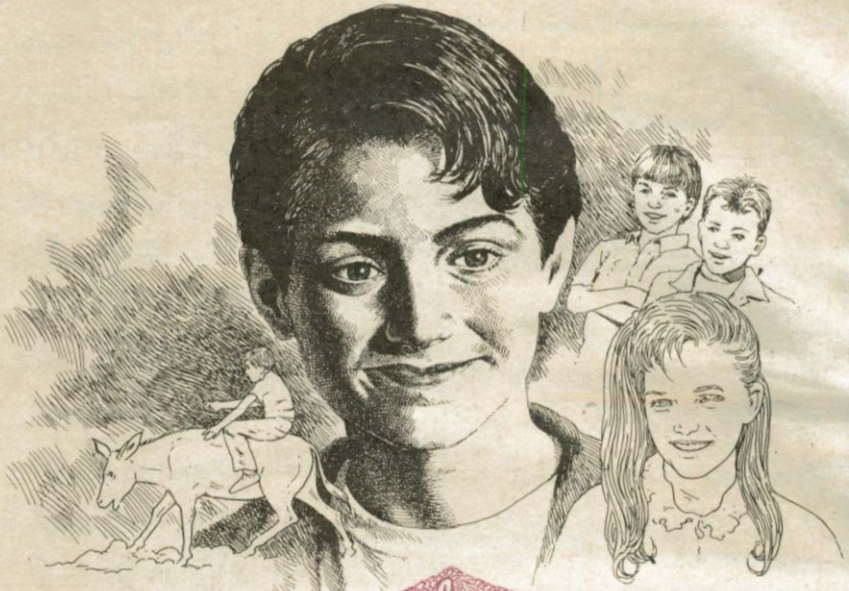

مفید ماموں

ثنا نور، بہاولپور

نام تو ان کا معید ماموں ہے مگر ہم ان کو مفید ماموں کہتے ہیں۔ ہونا تو ان کو آٹھویں میں جماعت میں چاہئے تھا لیکن ہیں وہ چوتھی جماعت میں۔ آپ سوچیں گے یہ کیسے ماموں ہیں؟ یہ جیسے بھی ماموں ہیں ہمارے لئے بہت اچھے ہیں۔ مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ دل چسپ حرکتیں کرتے ہیں۔ گپیں ہانکنے کے ماہر ہیں۔ اور شیخیاں بھی بہت بگھارتے ہیں۔ نقصان کسی کا نہیں کرتے اور سب کے فائدے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اب بتایئے ہم انہیں مفید ماموں نہ کہیں تو کیا کہیں اور کیوں کہیں؟

ابھی کل کی بات ہے ہم لوگ سیر کرنے گئے۔ ہمارے ماموں بھی ساتھ تھے۔ ہم نے ان سے شرط لگائی کہ آپ گدھے پر نہیں بیٹھ سکتے۔ سامنے سے ایک گدھا آرہا تھا۔ وہ اس کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکے اور پل بھر میں اس پر سوار

ہوگئے۔ گدھا اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا اور سرپٹ دوڑنے لگا۔ اب تو مفید ماموں کی سٹی گم ہوگئی۔ انہوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا اور ہمارے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے۔ خیر بڑی مشکل سے گدھے کو روکا گیا اور نیم جان ماموں کو نیچے اتارا گیا۔ ہمارا خیال تھا اس کے بعد وہ اپنی بہادری کے قصے نہیں سنایا کریں گے مگر جناب وہ بھی بڑے حوصلہ مند ہیں۔ گدھے کا اثر دو دن رہا اور تیسرے دن وہی ماموں تھے اور وہی ان کی آن بان تھی۔ لیکن جلد ہی ہماری اس دل لگی کا ایک دفعہ پھر سامان جمع ہوگیا۔ ہوا یوں کہ امی نے سوجی منگوائی ہم نے اس میں سے تھوڑی سی سوجی لی، اس میں آٹا ملایا اور چھپکلی بنا کر ان کے کپڑوں پر رکھ دی۔ جیسے ہی وہ کپڑے بدلنے لگے تو اس مصنوعی چھپکلی کو دیکھ کر ان کی تو جان ہی نکل گئی۔ اب وہ پورے کمرے میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان پر صورت حال واضح ہوئی تو کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے لگے۔

ویسے ہمارے ماموں ہیں بہت اچھے۔ معصوم اور مخلص اور پیار کرنے والے۔ ہم ان کو ستاتے رہتے ہیں لیکن وہ ہمیں کچھ نہیں کہتے۔ آپ ہی بتایئے ہم انہیں مفید ماموں کہتے ہیں تو ٹھیک کہتے ہیں نا!!

حساب

مرسلہ: طاؤد بلوچ، پسنی، مکران

ملا نصیرالدین نے سنا کہ قریبی شہر کا حاکم کفن دفن کے لئے ہر غریب آدمی کو اسی درہم دیتا ہے۔ ایک دن ملا کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اس لئے وہ حاکم کے پاس پہنچا اور کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ جو غریب آدمی آپ کے شہر میں مرتا ہے۔ اس کے لئے آپ اسی درہم دیا کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کے شہر کا ایک غریب آدمی ہوں اور مجھے روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ اسی لئے آپ مجھے ابھی چالیس درہم دے دیں اور میرے مرنے کے بعد حساب میں لگالیں۔ حاکم نے اس کی بات مان لی اور چالیس درہم ملا کو دے دیئے۔ چند دن کے بعد ملا دوبارہ حاکم کے دربار میں حاضر ہوا اور کہا۔ میری خواہش ہے کہ میں آپ کے شہر سے چلا جاؤں اور مرتے دم تک اس جگہ نہ آؤں اس لئے درخواست کرتا ہوں کہ باقی چالیس درہم بھی مجھے عطا کردیں تاکہ ہمارا آپ کا حساب پورا ہوجائے۔

غور سے دیکھیں یہ کیا ہے ؟

آنکھ مچولی کے گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والی رنگین تصویر ایک مکھی کی ہے ۔ جسے FRUIT FLY (میوہ مگس) کہتے ہیں۔ یہ تصویر مکھی کے اصل سائز سے ۱۲۰۰ گنا بڑی ہے ۔ ہمارے پڑھنے والوں میں سے اکثر نے مکھی کو تو بوجھ لیا مگر کون سی مکھی ؟ یہ کوئی نہ بوجھ سکا ۔

کوپن برائے خریداری آنکھ مچولی (۱۲ شمارے)

(۱۲ شماروں کی رعایتی قیمت اندرونی سرِورق پر دیکھئے)

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

براہِ مہربانی مجھے _____ تاریخ سے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے

فون نمبر: _____ دستخط: _____

کوپن برائے "کیپشن لگائیے انعام پائیے"

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

کیپشن: (_____)

کوپن برائے قصہ کوئز

نام: _____ ولدیت: _____

کلاس: _____ تعلیمی ادارہ: _____

پتہ: _____

نوٹ: ہر شعبے کے لئے الگ کوپن آنا ضروری ہے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام آسکتا ہے۔ کوپن کی فوٹو کاپی قابلِ قبول نہیں۔

تصویری خاکے ـــ بوجھیئے تو کون ؟

جی نہیں ! نہ تو آئن اسٹائن نہ ہی گلیلیو - ، نہ قوی خان نہ یوسف خان - آپ سب ہار گئے'' ہم جیت گئے - کوئی بھی نہ بوجھ سکا - یہ تصویری خاکے فرضی ہیں - ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں -

کیپشن لگایئے - انعام پایئے

''آنکھ مچولی اتنی جلدی آگیا - نہیں ..... ایسا نہیں ہو سکتا ... !!''

یہ کیپشن نارتھ ناظم آباد کراچی کی یسریٰ خان نے بھجوایا - بہت سے کمزور کیپشنز میں سے اسی کو مناسب قرار دیا گیا -

اقراء

خالد بن محمود احمد

عجیب تھی وہ قوم، عجیب تر تھے اس کے سردار اور عجیب ترین تھی ان کی خواہش۔

وقت کا پیغمبر ان میں موجود تھا۔ جہاد کا ان کو حکم ملا اور انہوں نے مطالبہ کردیا کہ "ہمارا تو ایک بادشاہ ہونا چاہئے جس کے احکام کو ہم مانیں اور جس کی قیادت میں ہم لڑیں۔"

اپنے وقت میں ہر پیغمبر اپنی قوم کے ہر فرد سے افضل اور برتر رہا ہے کیونکہ وہ خدا کا نمائندہ اور خدا کا منتخب ہوتا تھا۔ پیغمبر موجود ہے مگر مطالبہ یہ ہے کہ "ہمیں ایک بادشاہ چاہئے۔"

خیر خواہش پوری ہوگئی۔ ارشاد ہوا "طالوت تمہارا بادشاہ ہوگا۔"

سرداروں کی انانیت پر غضب کی چوٹ پڑی۔ "بادشاہت پر ہمارا حق زیادہ ہے، ہم حسب نسب رکھتے ہیں، ہم معزز خاندانوں کے ہیں۔" وہ بڑبڑائے۔ "اور اس کے پاس مال و دولت بھی نہیں ہے۔" انہوں نے اعتراض کیا۔

جواب ملا۔ "اللہ نے اسے تم میں برتر کیا ہے اور وہ طالوت علم میں اور جسم میں تم سے زیادہ ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے بادشاہت عطا کردیتا ہے۔"

یہ پاک ارشاد، جس نے اعتراض کرنے والوں کے منہ بند کردیئے ایک طرف تو یہ فیصلہ کن بات بتاتا ہے کہ قادر مطلق بس اللہ تعالیٰ ہے، اس کی مرضی جس کو جیسا چاہے نواز دے۔ حسب نسب کے، مال و دولت کے پیمانے مخلوق کے لئے ہیں، خالق کے لئے نہیں۔ اور دوسری طرف اسی ارشاد میں ایک پیمانہ بادشاہت کے لئے بھی موجود ہے۔ یعنی بادشاہت کے لئے دو بنیادی چیزیں ضروری ہیں

۱۔ علم ۲۔ جسم

سمجھ میں آتا ہے کہ علم امور مملکت کے قوانین کے لئے اور جسم ان قوانین کو نافذ کرنے کی قوت کے لئے۔ لیکن کیا آپ نے غور کیا کہ بادشاہت کی ان دونوں بنیادی چیزوں میں پہلے نام "علم" کا لیا گیا ہے۔ وجہ اس کی بھی سمجھ میں آتی ہے۔ مضبوط جسم، علم کو لانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا جبکہ علم، مضبوط جسم بنانے کا ذریعہ ضرور بن سکتا ہے۔

علم عظیم تر ہے!!!

IMPORTED

QUICE
QUICE Lemon Lime
2 GREAT CANS

2 EXCITINGWAYS TO COOL DOWN & FRESHEN UP !

Quice Food Industries Ltd.
11/139, Jamaluddin Afghani Road, Near Bahadurabad

REGD. No. SS-246 NOVEMBER 1996
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI